اربعین حدیث النوویؒ

تشریح (انگریزی)

جمال الدین زرابوزو

اردو ترجمہ حدیث نمبر 1

"إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّات..."

ترجمہ زیرِ نگرانی: حکیم نعیم الدین زبیری (ندوی)

مترجم: سیّد فراست شاہ

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی

اربعین حدیث النوویؒ

تشریح (انگریزی)

جمال الدین زرابوزو

اردو ترجمہ حدیث نمبر 1

"اِنما الأعمال بالنیات......"

ترجمہ زیرِ نگرانی: حکیم نعیم الدین زبیری (ندوی)

مترجم: سید فراست شاہ

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی

کتاب: اربعین حدیث النووی ؒ

مترجم: سید فراست شاہ

ناشر: اسلامک ریسرچ اکیڈمی۔ کراچی
(ادارہ معارفِ اسلامی۔ کراچی)

تقسیم کنندہ: اکیڈمی بک سینٹر (A.B.C.)
ڈی۔۳۵، بلاک۔۵، فیڈرل بی ایریا
کراچی۔۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۳۴۹۸۴۰۔۳۶۸۰۹۲۰۱(۰۲۱)

اشاعت: شوال المکرم ۱۴۳۳ھ ۔ ستمبر ۲۰۱۲ء

قیمت: ...... روپے

فہرستِ مضامین

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

تعارّف

الحمدوللّٰلہ ربّ العالمین!

آپ جس کام کا مطالعہ کرنے جارہے ہیں وہ امام النووی کی اربعین پر محترم جمال الدین زرابوزو کی انگریزی میں لکھی گئی شرح کے اردو ترجمے کا ابتدائی حصہ ہے، جسے راقم نے حکیم نعیم الدین زبیری (مرحوم) کے زیرِ نگرانی مکمل کیا۔ یہ کتابچہ اس سلسلے کی پہلی حدیث کی تشریح پر مبنی ہے، بیالیس (42) احادیث پر مشتمل اربعین نووی کی انگریزی میں لکھی گئی اس شرح کا مکمل ترجمہ انشاء اللہ عنقریب طباعت کے لیے تیار ہو جائے گا۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

مُحی الدین ابوزکریہ یحیی ابنِ شرف الحزامی النووی اپنی جائے پیدائش النوا کے تعلّق سے النووی کے نام سے مشہور ہیں۔ النوا شہرِ دمشق کے جنوب میں واقع ایک قصبہ تھا جہاں امام النووی کی ولادت 631 ہجری بمطابق 1233 عیسوی میں ہوئی۔ النووی شافعی مکتبہٗ فقہ کے ایک اہم عالمِ دین ہیں، امام النووی نے حج کے سفر کے علاوہ چند دیگر مقامات کے اسفار کیے لیکن مستقل سکونت دمشق ہی میں رکھی اور اپنی وفات سے کچھ ہی عرصہ قبل واپس اپنے آبائی قصبے النوا تشریف لے گئے جہاں 24 رجب 676 ہجری بمطابق 1277 عیسوی میں ان کا انتقال ہوا۔

النووی نے اپنی اربعین کے لیے جن احادیث کا انتخاب کیا وہ دینِ اسلام کے تقریباً سارے ہی امور کا احاطہ کرتی ہیں۔ النووی اپنے اس کام کے بارے میں لکھتے ہیں، ”ہر ایسے شخص کے لیے جو آخرت کا خواہشمند ہے اور اُسے اپنے پیشِ نظر رکھتا ہے ضروری ہے کہ وہ

ان احادیث سے مانوس ہو کیونکہ یہ دین کے اہم ترین اُمور کا احاطہ کرتی ہیں اور اللہ کی اطاعت کی تمام راہوں کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ یہ حقیقت ہر اس شخص پر آشکار ہو جاتی ہے جو ان احادیث پر غور و فکر کرتا ہے۔"

ان احادیث کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ چالیس احادیث پر مشتمل مجموعے کئی اشخاص نے مرتّب کیے لیکن آج بھی جب اربعین یا چہل حدیث کہا جاتا ہے تو اُس سے مراد النووی کا مجموعہ ہی لیا جاتا ہے۔ اس مجموعے کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی متعدّد تشریحات لکھی گئیں۔ ابنِ رجب نے اپنی جامع العلوم والحکم میں النووی کی ان احادیث کی تشریح لکھی اور ان میں آٹھ (8) مزید احادیث کا اضافہ کر کے کل تعداد پچاس (50) تک پہنچادی۔ دورِ جدید کے اصحابِ علم آج تک ان احادیث کی تشریحات لکھ رہے ہیں۔ جدید دور کی تشریحات میں ناظم سلطان کی تشریح اور مصطفیٰ البُغی اور مُحی الدین مِستو کی مشترکہ کاوش شامل ہیں، محمد حیات السندی نے بھی اربعین کی ایک اہم شرح تصنیف کی۔ دورِ جدید میں اردو زبان میں لکھی گئی تشریحات میں مولانا محمد عاشق الٰہی، پروفیسر سعید مجتبیٰ صدیقی اور مولانا امیر الدین مہر کی کاوشیں شامل ہیں جن میں ان احادیث کی مختصر تشریح پیش کی گئی ہے۔ محترم جمال الدین زرابوزو نے انگریزی زبان میں اربعین نووی کی ایک مفصّل تشریح تصنیف کی ہے۔

محترم جمال الدین زرابوزو امریکی شہری ہیں، آجکل ریاست کلیفورنیا میں مقیم ہیں اور درس و تدریس کا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ محترم زرابوزو سن 1960 میں ایک رومن کیتھولک گھرانے میں پیدا ہوئے۔ حق کی تلاش نے انہیں راہِ راست پر ڈال دیا جہاں حق تعالیٰ کی رحمت ان کی منتظر تھی اور یوں وہ سولہ (16) برس کی عمر میں مشرّف بہ اسلام ہوئے۔ معاشیات میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی اور اسی مضمون میں ڈاکٹریٹ کے کام کو مکمل نہ کیا

اور حُصولِ علمِ دین میں لگ گئے۔ کئی کتابیں تصنیف کیں، امام النووی کی اربعین پر ان کی تشریح ایک معارکتہ آراء تحقیقی کام ہے۔ حدیث کے مختلف پہلوؤں پر گہری تحقیق کے بعد ہی ایسا کام ممکن ہو سکتا ہے۔ دیگر امتیازی خصوصیات کے علاوہ اس کام کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس میں دورِ حاضر کے معاملات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

یوں لگتا ہے کہ مصنّف نے اس بات کی دانستہ کوشش کی ہے کہ اربعین نووی کی اس شرح میں اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ قارئین میں عربی زبان، تخریجِ حدیث اور اسماء الرّجال جیسے اہم مضامین کا ذوق پیدا کیا جائے۔ وہ ان مضامین کا عمومی طور پر احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ بعض مقامات پر ان پر تفصیلی بحث کرتے ہیں۔ لہٰذا، اس شرح کو پڑھنے والوں میں کسی قدر ان مضامین سے رغبت اور ان کا ذوق پیدا ہو گا۔ عام طور پر اردو پڑھنے والوں میں ان علوم کے ذوق کی کمی محسوس کی جاسکتی ہے، شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ جن اشخاص نے احادیث کے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں عموماً انہوں نے اپنی تصانیف میں ان مضامین کو خاص اہمیت نہ دی۔ اس احساس کے پیشِ نظر کہ اردو پڑھنے والے حدیث کی کوئی شرح پڑھتے وقت ایک خاص طرزِ تحریر کی توقّع رکھتے ہوں گے، اس اردو ترجمہ میں بعض مقامات پر ایسی بحثوں کی تفصیل کو جو ایک قاری کے لیے غیر متوقّع ہو سکتی ہیں، حدیث کے اختتام پر ضمیموں کی شکل میں رکھ دیا گیا ہے، تاکہ پڑھنے والے کی روانی میں خلل نہ آئے۔ بہر حال وہ مضامین جو ان ضمیموں کے تحت رکھے گئے ہیں اہم ہیں اور قارئین سے ان پر توجّہ کی توقّع ہے۔ اس تشریح کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں استعمال کیے گئے تقریباً تمام تر مواد کے لیے تفصیلی حوالے دیئے گئے ہیں۔

محترم جعفر شیخ ادریس محترم زرابوزو کے اس کام کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ”حدیث کے ہر ہر فقرے پر لِسانی، منطقی، فقہی، قانونی اور دیگر پہلوؤں سے تحقیق کی گئی ہے۔“ مترجم

کی رائے میں دورِ جدید میں اردو زبان میں کئی مارکتہ آراء کتابیں دینِ اسلام کے کئی موضوعات پر ایسی لکھی گئی ہیں جو دیگر زبانوں مثلاً، انگریزی وغیرہ میں ترجمہ کرنے کے لائق ہیں۔ تاہم، انگریزی زبان میں بھی ماضیٔ قریب میں چند نہایت عمدہ کتابیں اسلامی موضوعات پر لکھی گئی ہیں جو اردو اور دیگر زبانوں میں ترجمہ کرنے کے لائق ہیں اور ان کتابوں میں جو سرفہرست ہیں ان میں محترم جمال الدین زرابوزو کی یہ شرح ہے جو انہوں نے امام النووی کی اربعین پر لکھی۔ مترجم کے مربّی اوراستاد محترم حکیم نعیم الدین زبیری نے مترجم کے اس خیال سے اتفاق کیااور شفقت کی کہ اس کام کی نگرانی فرمائیں۔

حکیم نعیم الدین زبیری مترجم کے اس کام میں نہ صرف معاون ومددگار تھے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے حوصلہ دیئے بنامترجم کے لیے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ممکن نہ ہوتا۔ حکیم صاحب ندوۃ العلوم لکھنو سے فارغ التحصیل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر حکیم بھی تھے۔ سن 2012ء میں اپنی وفات تک ہمدر دیونیوسٹی سے وابستہ رہے جہاں وہ تاحیات اسکالر کے مقام پر فائز تھے۔ حکیم سعید کے قریبی ساتھی اور معاونِ کار رہے۔ ان کی متعدّد تصانیف ہیں جن میں ہمدرد سے شائع ہونے والا تیسویں(30) پارے کا وہ ترجمہ بھی ہے جو خصوصاً بچوں کی ذہنی سطح کو سامنے رکھتے ہوئے کیا گیا۔ حکیم صاحب اپنی علالت کے باوجود دو سال سے زیادہ کے عرصے تک مسلسل اس کام کی نگرانی کرتے رہے۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے۔ اس کام کے دوران میں نے ایسے ہی کئی دعائیہ کلمات کئی بار ان کی زبان سے محترم جمال الدین زرابوزو کے بارے میں سُنے۔ اللہ ان سب افراد کو جن کا اس کام میں جس قدر بھی حصہ ہے۔ اپنی بیش بہا نعمتوں اور رحمتوں سے نوازے۔

ترجمے کے ہر کام میں اصل تحریر کے مقابلے میں کچھ نہ کچھ کمی بیشی رہ جانا ایک فطری بات ہے۔ اس ترجمے کے دوران حتّی المقدور اس بات کی دانستہ کوشش کی گئی ہے کہ اصل

تحریر سے قریب تر رہا جائے۔ تاہم، بعض مقامات پر مترجم نے خود یا محترم حکیم نعیم الدین زبیری (مرحوم) کے مشورے کے مطابق کچھ مختصر نوٹ وضاحت کے لیے ضروری سمجھے، یہ جملے اور نوٹ خمیدہ بریکیٹ{ } میں رکھے گئے ہیں تا کہ پہچانے جائیں۔ اس تحریر میں قرآنی آیات کے تراجم سیّد مودودی کے ترجمۂ قرآن سے لیے گئے ہیں۔ احادیث کے تراجم میں اصل الفاظ سے قریب تر رہتے ہوئے مفہوم پیش کیے گئے ہیں لہٰذا، اسے ترجمے کی بجائے مفہوم ہی سمجھا جائے،اوکماقال رسول ﷺ۔

میں اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کا ممنون ہوں جس ادارے کے توسط سے یہ کتابچہ آپ تک پہنچ رہا ہے۔ یہ تعارّف مکمل نہیں ہو گا اگر اس میں دو ایسے اشخاص کا ذکر نہ کیا جائے جن کا اس کام کی تکمیل میں اہم کردار ہے۔ محترم معظّم علی قادری (مرحوم) اللہ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے جنہوں نے اپنے دفتر میں کام کرنے والے ثاقب شاہ کی خدمات ٹائپنگ کے کام کے لیے پیش کیں۔ ثاقب شاہ جو اب بھی اس کام کو جاری رکھے ہوئے ہیں انہوں نے نہ صرف ٹائپنگ کا کام حسنِ خوبی سے انجام دیا بلکہ اس کام کے دوران کئی مقامات پر اپنی بہترین فنّی رائے سے نوازا، میں ان دونوں اشخاص کا تہہ دل سے مشکور ہوں اور اجرِ عظیم کے لیے دعا گو ہوں۔ میں اردو زبان کے مدرّس محترم فرخ قریشی اور مولانا عمران اصغر کا بھی مشکور ہوں، ان حضرات نے اس کام کی نوک پلک درست کرنے میں مدد فرمائی، اللہ تعالیٰ ان کی اس کام پر نظر ثانی کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت بخشے۔

مترجم

سیّد فراست شاہ

رمضان المبارک 1433ھ بمطابق 2012ء

حدیث نمبر 1

"یقیناً، تمام اعمال کا دارومدار نیّتوں پر ہے۔۔۔"

عَنْ أَمِيرِالْمُؤْمِنِيْنَ أَبِيْ حَفْصٍ عُمَرَ ابْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ، سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَانَوَى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا يُصِيْبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلٰى مَاهَاجَرَ إِلَيْهِ۔

رَوَاهُ إِمَامَا الْمُحَدِّثِيْنَ أَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ مُحَمَّدُ بْنُ إِسْمَاعِيْلَ بْنِ إِبْرَاهِيْمَ بْنِ الْمُغِيْرَةِ ابْنِ بَرْدِزْبَهْ الْبُخَارِيُّ وَأَبُوْ الْحُسَيْنِ مُسْلِمُ بْنُ الْحَجَّاجِ بْنِ مُسْلِمٍ الْقُشَيْرِيُّ النَّيْسَابُوْرِيُّ فِىْ صَحِيْحَيْهِمَا اللَّذَيْنِ هُمَا أَصَحُّ الْكُتُبِ الْمُصَنَّفَةِ۔

امیر المومنین عمرؓ ابن الخطاب کی سند پر روایت ہوا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے رسول ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا، "یقیناً، تمام اعمال کا دارومدار نیّتوں پر ہے اور دائماً، ہر شخص کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیّت کی۔ لہٰذا، وہ جس کی ہجرت اللہ اور اسکے رسول کے لیے تھی، [تو پھر] اس کی ہجرت اللہ اور اسکے رسول کے لیے تھی؛ اور وہ جس کی ہجرت کسی دنیاوی فائدے کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کے لیے تھی، اس کی ہجرت اسی کے لیے تھی جس کے لیے اُس نے ہجرت کی۔"

اس حدیث کو محدّثین کے دو اِماموں، ابو عبد اللہ محمد ابنِ اسماعیل ابنِ ابراہیم ابنِ المغیرۃ ابنِ بردزبہ البخاری اور ابو الحُسین مسلم ابنِ الحجاج ابنِ مسلم القشیری النیشاپوری نے اپنے

مجموعہ ہائے احادیثِ صحیحہ میں شامل کیا ہے جو کہ حدیث کی سب سے مستند تالیفات ہیں۔[1]

منتخب عربی الفاظ اور معنی

عن: ''کی سند پر''۔

أَميرالمؤمنين: ''مومنوں کے سردار،'' یہ لقب مسلمانوں کے خلیفہ یا سربراہ کیلئے استعمال ہوتا تھا۔

أَبي حفص: ''حفص کے والد'' یہ عربی میں نام لینے کا مخصوص طریقہ ہے{حضرت عمرؓ کی کنیت}۔

قال: ''اس نے کہا'' یا ''فلاں نے کہا''۔

سمعت: ''میں نے سنا''۔

رسول اللّٰہ: ''اللہ کے پیغمبر''۔

---

[1] اس حدیث کی تشریح پر ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ اربعین النووی پر تشریحات اور دیگر لکھی گئی تشریحاتِ حدیث کے علاوہ خاص اس حدیث پر کئی اور اشخاص کے کام موجود ہیں۔ عمر الاشقر کا PhD کا مقالہ مقاصد المخالفین فی ما یتعبّد وبہی لربِّ العالمین او النیّۃ فی العبادۃ (کویت: مکتبہ الفلاح، 1981)، بنیادی طور پر سارے کا سارا اس حدیث پر ایک بحث ہے۔ ایک اور بہترین کام جو ''نیّت'' کے موضوع پر کیا گیا، احمد ابنِ ادریس القرافی، الامنیّہ فی ادرک النیّۃ (مکّہ: دارالباز، 1984) ہے، ابنِ تیمیہ نے جو استبصار اس حدیث پر کیا اس کے کئی نکات کا احاطہ زیرِ نظر تشریح میں نہیں کیا گیا۔ ان کا یہ استبصار انکی ان تصنیفات میں ملتا ہے: مجموعہ فتاوی ابنِ تیمیہ، جلد 18، ص ص 285-244؛ شرح حدیث إِنَّمَا الْأَ عْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِيءٍ مَانَوَى (قاہرہ: مکتبہ السلام العالمیہ، 1981)؛ علم الحدیث (مکّہ: دارالباز، 1985)، ص ص۔ 206-168۔ صالح السدلان کی بھی اس حدیث سے متعلّق دو تصانیف موجود ہیں۔ ان میں سے ایک اس حدیث پر لکھی گئی مختصر تصنیف انما الاعمال بالنیات: دراسہ وتخریج وضبط وتالیق (ریاض؛ دارالوطن، 1414 ہجری) ہے۔ اس کو ان کی ایک ضخیم تصنیف کا حصہ بنایا گیا ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ النیّۃ واشارہ فی الاحکام الشریعہ (ریاض: دارالعالم الکُتب، 1993)۔ ان میں سے اس حدیث سے متعلّق چند اہم نکات کو اس تشریح میں شامل کیا گیا ہے۔

صلّی اللّہ علیہ وسلّم: ”آپ پر اللہ کی برکتیں اور سلامتی ہو“۔

یقول: ”کہہ رہے تھے“۔

إنّما: ”یقیناً۔۔۔صرف“”دائماً۔۔۔لیکن اس سے۔“ اس کے اظہار میں تاکید اور تخصیص دونوں مضمر ہیں۔

الأعمال: ”کام یا عمل کی جمع“۔

بالنیّات: یہ ایک مرکب لفظ یا فقرہ ہے۔ یہاں پر حرف ب{با} بمعنی سے، کے ساتھ یا کے مطابق ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ ب ”سببیہ“ ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ جملے میں نیّتوں اور اعمال کے درمیان وجہ یا سبب کا تعلّق ہے۔ یعنی اعمال نیّتوں کے سبب ہوتے ہیں یا یہ کہ نیّت ہی عمل کیلئے تحریک ہے۔(النیّات جمع ہے نیّت کی)۔

لکلّ: یہ بھی ایک مرکب ہے یہاں حرف ل {لام} کے معنی ”کیلئے“ اور کل کے معنی ”سارے“ کے ہیں۔

امری: ”مرد“ اس کا مؤنث امراۃ ہے جو آگے چل کر حدیث میں استعمال ہوا ہے۔

ما: ”جو کچھ“ عام طور پر بے جان چیزوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

نوی: ”اس نے نیّت کی“۔

فمن: یہ بھی ایک مرکب ہے۔ اس میں حرف ف{فا} سے مراد ”لہٰذا“ یا ”اس وجہ سے“، من ”جو کوئی“ کو ظاہر کرتا ہے جو کہ جاندار چیزوں کیلئے استعمال ہوتا ہے جبکہ ما جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا بے جان چیزوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

کانت: ”ہوا“ واحد مؤنث، ماضی، صیغۂ غائب[Third Person] ہے۔

ھجرتہ: ھجرۃ کے معنی ہیں کسی چیز کو چھوڑنا، یہاں اس سے مراد غیر مسلموں کے علاقے کو چھوڑ کر اسلامی علاقے میں منتقل ہو جانا ہے۔ آخر میں موجود حرف ہ(ہا)

اسمِ ضمیر [Pronoun] ہے اور اسکے معنی "اسکا" ہیں۔

إلی: اس کا عمومی استعمال "کی طرف" کے معنوں میں ہوتا ہے لیکن یہاں اسکا عین انہی معنوں میں ترجمہ کرنا مشکل ہوگا۔

رسولہ: "اسکا رسول" یہاں آخر کا ہ {ہا} "اسکا" کو ظاہر کرتا ہے۔

لدنیا: یہ ایک مرکب ہے ل {لام} کے معنی "اسکے لیے" اور دنیا کے معنی دنیاوی زندگی ہیں۔

یصیبھا: اس سے مراد کچھ حاصل کرنا یا کچھ ملنا ہیں۔

ینکحھا: "وہ (مرد) اس (عورت) سے نکاح کرے"۔

تخریج[1]

اس حدیث کو جن ائمّہِ حدیث نے اپنے مجموعہ ہائے احادیث میں شامل کیا ہے ان میں البخاری، مسلم، ابوداؤد، الترمذی، النسائی، ابنِ ماجہ، الطحاوی (شرح معانی الآثار) الدارقُطنی، ابن ُخزیمہ، ابنِ حِبّان، ابنِ عساکر، ابنِ الجارود، البیھقی، ابوعُیینہ اور ابونُعیم شامل ہیں ان کے علاوہ اور کئی مجموعہ ہائے احادیث میں بھی یہ حدیث ملتی ہے۔ ابو محمد نے ایسے سو سے زیادہ حوالوں کی فہرست مرتّب کی ہے جن میں یہ حدیث ملتی ہے اور روایت کا سلسلہ رسول ﷺ تک پہنچایا گیا ہے۔[2]

---

[1] یہاں تخریج بمعنی حدیث کا علم ہے۔ ان کتابوں کے بارے میں معلومات شامل کی گئی ہیں کہ جن میں یہ حدیث مذکور ہے۔ اس میں حدیث کی سند اور اُسکے درجے کے متعلّق اخذ کیا گیا نتیجہ پیش کیا گیا ہے، یقیناً، صحیح البخاری و صحیح مسلم کی جو احادیث چالیس احادیث کے اس مجموعے میں موجود ہیں وہ تمام مستند ہیں۔ عام طور پر تخریج کے ضمن میں اختصار سے کام لیا گیا ہے دراں حالیکہ مصنف کے خیال میں کوئی ایسی اہم معلومات موجود ہوں جو تفصیلی بحث کی متقاضی ہوں، مثال کے طور پر زیرِ نظر حدیث نمبر 1 میں اس ضمن میں زیادہ تفصیلی بحث موجود ہے۔

[2] ابنِ محمد، ص ص۔ 50-43۔

مندرجہ بالا معلومات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ عملی طور پر یہ حدیث تقریباً سارے ہی مجموعہ ہائے احادیث میں موجود ہے، جب ایسا ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام مالک کے پاس یہ حدیث موجود تھی اور انہوں نے اسے دوسرں تک پہنچایا، لیکن کیا یہ حدیث انہوں نے اپنے مجموعۂ احادیث مؤطا میں شامل کی؟ امام مالک نے مؤطا میں کئی بار ردّوبدل کی اس وجہ سے مؤطا کے مختلف نسخے موجود ہیں ان نسخوں کی اکثریت میں یہ حدیث موجود نہیں، البتہ مؤطا کے اس نسخے میں یہ حدیث موجود ہے، جسے محمد ابنُ الحسن الشیبانی نے جاری کیا۔ محمد ابنُ الحسن امام ابوحنیفہ کے قریبی ساتھی، شاگرد اور معاونِ کار تھے۔ انہوں نے مدینہ جاکر امام مالک سے مکمل مؤطا سیکھی اور اپنے شاگردوں تک پہنچائی۔ [1]

حدیث کا سلسلۂ روایت

کئی مجموعہ ہائے احادیث میں اس حدیث کی موجودگی سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید یہ ایک ایسی حدیث ہے جسے کئی صحابہ، تابعین اور اُن کے بعد آنے والوں کی کثیر تعداد نے روایت کیا ہو گا۔ شاید یہ گمان تک گزرے کہ یہ ایک متواتر حدیث ہے۔ درحقیقت یہ حدیث متواتر[2] کے یکسر مختلف قبیل سے ہے جسے غریب[3] کہتے ہیں۔ اس حدیث کے تمام سلسلے جاکر ایک ہی مصدّقہ اور صحیح روایت پر ملتے ہیں جیسا کہ آگے شکل نمبر1 میں دیئے گئے نقشے سے واضح ہے۔

---

[1] اس بحث کو دیکھیں الاشقر، مقاصد، ص ص۔521-520 پر۔

[2] متواتر کے معنی ہیں ایسی حدیث جسے ہر نسل کے کئی افراد نے روایت کیا اور ایسا ممکن نہیں کہ ان سب کا کسی جھوٹ پر اجماع ہو گیا ہو یا ان سب سے ایک ہی غلطی سرزد ہوئی ہو۔

[3] غریب کے معنی ہیں کہ سلسلۂ روایت کے کم از کم ایک مرحلے پر صرف ایک ہی قابلِ قبول راوی موجود ہو (نوٹ: یہ غریب کی ایک تعریف ہے جبکہ بعض اصحابِ علم اِسے مختلف انداز میں لیتے ہیں)۔

یہ نقشہ حدیث کی چھ مشہور کتابوں سے تشکیل دیا گیا ہے۔[1] اس کی آخری سطر پر یہ چھ کتابیں اور اوپر وہ سلسلے ہیں جن سے ہو کر یہ حدیث ان چھ کتابوں تک پہنچی ہے۔

---

[1] حدیث کی ''چھ کتابیں''؛ صحیح البخاری، صحیح مسلم، سنن النسائی، سنن ابو داؤد، سنن الترمذی اور سنن ابنِ ماجہ ہیں۔ چھ کتابوں کی اصطلاح یہ معنی نہیں رکھتی کہ ان تصانیف میں موجود تمام احادیث مستند ہیں یا یہ کہ یہ سب حدیث کی معتبر ترین کُتب ہیں۔ در حقیقت اس اصطلاح کے مشہور ہونے کی وجہ ان کتابوں کو ترتیب دینے والوں اور ان میں موجود راویوں کی شہرت ہے۔{نوٹ ان چھ کتابوں کو اکثر صحاح ستہ کہا جاتا ہے جو اس اصطلاح کا ایک نامناسب استعمال ہوگا اگر اس سے مراد یہ ہو کہ ان تمام کتابوں کی ساری ہی احادیث صحیح درجے کی احادیث ہیں۔ (مترجم)}۔

شکل نمبر 1

حضور اکرم
(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)
عمر ابن الخطاب
علقمہ ابن وقاص
محمد ابن ابراہیم
یحیی ابن سعید
مالک
عبداللہ ابن مسلمہ
ابن القاسم
النسائی
سفیان ابن عیینہ
یحیی ابن قزعہ
الحمیدی
ابن ابو عمر
البخاری
البخاری
مسلم
حماد ابن زید
مسدد
ابوالربیع العتکی
یحیی ابن حبیب
البخاری
مسلم
النسائی
سفیان الثوری
محمد ابن الفضل
محمد ابن کثیر
البخاری
عبدالوہاب الثقفی
محمد ابن المثنی
قتیبہ ابن سعید
مسلم، الترمذی
البخاری
سلیمان ابن حیان
اسحاق ابن ابراہیم
مسلم، النسائی
عبداللہ ابن مبارک
سلیمان ابن ابراہیم
محمد الحدانی
النسائی
مسلم
اللیث ابن سعد
محمد ابن المہاجر
مسلم، ابن ماجہ
یزید ابن ہارون
محمد ابن عبداللہ
مسلم
حفص ابن غیاث
محمد ابن عبداللہ
مسلم، النسائی

اس ترتیب سے پتہ چلتا ہے کہ رسول ﷺ سے کئی راستوں سے یہ حدیث روایت ہوتے ہوئے ان کُتبِ احادیث تک پہنچی۔ ان سلسلوں کا وہ واحد مصدّقہ حصہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ عمرؓ ابن الخطاب سے چلتا ہے اور عمرؓ سے صرف علقمہ نے یہ حدیث روایت کی ہے۔ محمد ابنِ ابراہیم علقمہ سے اور ان سے صرف یحیٰ ابنِ سعید روایت کرتے ہیں۔ البتہ، یحیٰ ابنِ سعید سے روایت کرنے والے بہت سے ہیں جیسا کہ نقشے میں دی گئی ترتیب سے واضح ہے۔ اس کے باوجود حدیث کو صحیح تسلیم کرنے میں کوئی بات مانع نہیں۔ اگر اس واحد سلسلے میں موجود راوی جو کہ زیادہ تر علما اور اساتذہ، معتبر اور ماہرِ فن افراد ہیں تو یہ بات غیر اہم ہو جاتی ہے کہ صرف ان کے ذریعے ہی یہ حدیث روایت ہوئی ہے۔

ان راویوں کا ایک مختصر جائزہ جن کے ذریعے سے یہ حدیث روایت ہوئی ہے یہ ثابت کر دے گا کہ محض اس بنا پر اس حدیث کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ یہ حدیث صرف ان ہی کے ذریعے سے روایت ہوئی۔[1]

(1) عمرؓ ابن الخطاب: یہ رسول ﷺ کے بہت مشہور صحابی اور اسلام کے خلیفۂ ثانی ہیں۔ ان کے معتبر، ایماندار اور ماہرِ فنِ روایت ہونے پر اہلِ علم نے تاریخ کے کسی دور میں کوئی شک نہیں کیا۔

(2) علقمہ ابنِ وقاص اللیثی: آپ رسول ﷺ کے دور میں پیدا ہوئے۔ سب سے زیادہ مضبوط یہ رائے معلوم ہوتی ہے کہ ان کی رسول ﷺ سے ملاقات نہیں ہوئی، اس بنا پر یہ صحابی نہیں بلکہ تابعین کے زُمرے میں آتے ہیں۔ انہوں نے بہت کم احادیث روایت کیں، جن اصحابِ رسول ﷺ سے انہوں نے احادیث روایت کیں ان میں

[1] دیکھیں، السدلان، حدیث، ص ص۔ 41-39۔

عمرؓ ابن الخطاب، عبد اللہؓ ابنِ عمرؓ، معاویہؓ اور بعض دیگر اصحابِ رسول ﷺ شامل ہیں۔ الزھری اور دیگر اشخاص ان سے روایت کرتے ہیں۔ ان کو علمائے حدیث نے معتبر (ثقہ) مانا ہے، جیسا کہ النسائی نے انہیں ثقہ تسلیم کیا ہے۔ ان کا انتقال عبد الملک ابنِ مروان کے دور میں ہوا۔

(3) محمد ابنِ ابراہیم ابنِ الحارث القریشی: یہ ایک بہت مشہور امام اور معتبر راوی ہیں انہوں نے کئی صحابہ سے روایت کیا جن میں ابو سعید الخذریؓ اور جابر ابنِ عبد اللہؓ شامل ہیں۔ امام اوزائی اور ابنِ اسحٰق نے ان سے روایت کیا۔ ان کی روایات حدیث کی چھ مشہور کتابوں میں سے ہر ایک میں موجود ہیں انہوں نے 120 ہجری میں وفات پائی۔

(4) یحییٰ ابنِ سعید ابنِ قیس الانصاری: آپ ایک مشہور اور معتبر تابعی ہیں آپ نے انس ابنِ مالکؓ، الصائب ابنِ یزیدؓ اور اسامہ ابنِ سہلؓ سے روایت کیا۔ جن افراد نے یحییٰ سے روایت کیا ان میں امام مالک اور شعبہ شامل ہیں یحییٰ القطان بھی ان سے روایت کرنے والوں میں شامل ہیں جنھوں نے ان سے تقریباً تین سو احادیث روایت کیں۔ آپ نے 143ھ میں وفات پائی۔

وہ یحییٰ ابنِ سعید ہی تھے جن سے یہ حدیث بہت زیادہ روایت ہوئی اس کی عمومی وجہ ان کے شاگردوں کی کثرت اور ان کی شہرت ہے۔ امام النووی کے مطابق دو سو افراد نے یہ حدیث یحییٰ سے روایت کی [1] کچھ اور افراد نے یہ تعداد اس سے بھی زیادہ بتائی ہے، تاہم فتح الباری میں ابنِ حجر اس کثیر تعداد سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہوں نے مختلف مجموعہ ہائے احادیث کی تحقیق کی اور اس تحقیق کے مطابق ایسے راویوں کی کل تعداد سو سے

[1] الاشقر، مقاصد، ص۔528۔

بھی کم ہے جنہوں نے یحییٰ ابنِ سعید سے یہ حدیث روایت کی[1]۔ بہر طور یہ امر بر حق ہے کہ یحییٰ ابنِ سعید سے افراد کی ایک کثیر تعداد نے یہ حدیث روایت کی جو شاید سو کے قریب ہو۔

قارئین نے یہ بات نوٹ کی ہو گی کہ اس حدیث کے سلسلۂ روایت میں یہ تین راوی علقمہ، محمد ابنِ ابراہیم، اور یحییٰ ایک ہی نسل سے تعلّق رکھتے ہیں اور یہ سب تابعی ہیں، لہٰذا، ایک تابعی دوسرے سے روایت کرتا ہے اور دوسرا تیسرے سے۔ گو کہ یہ طریقۂ ترسیل محدود نہیں لیکن اس طریق کی ترتیب بہت عام بھی نہیں۔

خیال رہے کہ اس حدیث کی دیگر روایات بھی موجود ہیں جن میں سے چند عمرؓ ابن الخطاب سے اور چند دیگر صحابہ سے روایت ہوئی ہیں، تاہم ایسی تمام روایات میں نقص ہیں۔ علمائے حدیث نے ان پر بحث کی اور اس کی بنیاد پر ان روایات کو رد کر دیا، یعنی اس حدیث کی واحد مستند روایت وہی ہے جو عمرؓ ابن الخطاب اور علقمہ کے سلسلے سے یحییٰ تک پہنچی۔[2]

کیا یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ یہ غریب ہے؟

یوں معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اس حدیث کو اس کے غریب ہونے کی بنیاد پر تسلیم نہیں کرتے، یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے کہ اکثر غریب احادیث مستند نہیں ہوتیں۔ امام احمد کا قول ہے کہ ”غریب احادیث سے ہوشیار رہو کیونکہ ایسی اکثر احادیث کذّاب سے آئی ہیں۔“[3] بہر حال اس سے کوئی اُصول ایسا نہیں نکلتا کہ تمام غریب احادیث کو مسترد کر دیا جائے۔ یہ علمائے حدیث کا طریق نہیں۔ جیسا کہ زیرِ نظر حدیث کا معاملہ ہے، اس کے بارے

---

[1] الاشقر، مقاصد، ص۔ 528۔

[2] حدیث کی دوسری روایات پر بحث کا مطالعہ کرنے کیلئے دیکھیے ابنِ محمد، ص ص۔ 47-45۔

[3] حوالہ درابنِ تیمیہ، مجموعہ، جلد 18، ص۔ 247۔

میں کوئی ایسا ثبوت نہیں کہ جس کی بنیاد پر اسے مسترد کر دیا جائے، صرف یہ وجہ کہ یہ حدیث ایک ہی سلسلے سے آئی ہے اس بات کے لیے ناکافی ہے کہ اس حدیث کو رد کر دیا جائے۔ ابنِ تیمیہ نے نشاندہی کی ہے کہ اس قبیل کی اور بھی احادیث ہیں جو مستند قرار دی گئی ہیں اور ایسی احادیث صحیح البخاری میں بھی موجود ہیں[1]۔

کیا یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ یہ شاذ یا منقطع ہے؟

اس حدیث کے بارے میں دو اور اعتراضات سامنے آئے ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ حدیث شاذ[2] ہے۔ شاذ ضعیف حدیث کی ایک قسم ہے جس کے بارے میں یہ ثابت ہو کہ راوی نے کچھ روایت کیا لیکن اس سے زیادہ معتبر ذریعے نے اس سے اختلاف کیا۔ در حقیقت مذکورہ حدیث کے معاملے میں یہ اعتراض کہ یہ شاذ ہے ایک غلط مفروضے کی بنیاد پر ہے۔ اس غلط مفروضے کی وجہ شاذ کی وہ غلط تعریف ہے جو حاکم نے پیش کی۔ حاکم کی تعریف کے مطابق شاذ ایسی حدیث کو کہا جاتا ہے جس کا واحد راوی ثِقہ ہو لیکن اس کی کسی اور ذریعے سے تصدیق نہ ہو سکے۔ شاذ حدیث کی صحیح تعریف امام شافعی نے ان الفاظ میں بیان فرمائی "شاذ روایت وہ ہے جس میں ایک ثِقہ راوی ایسی روایت کرے جو دیگر اقوال کے خلاف ہو اس میں ایسی روایت شامل نہیں جس میں صرف یہ صِفت ہو کہ اس کا ایک ہی راوی ہو۔"[3]

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس حدیث کی روایت کا سلسلہ منقطع (ٹوٹا ہوا ہو، جس میں ایک راوی محذوف ہو) ہے۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یحیٰی نے یہ حدیث محمد ابنِ ابراہیم سے

---

[1] ابنِ تیمیہ، مجموعہ، جلد 18، ص ص۔ 247-248۔

[2] الاشقر، مقاصد، ص۔ 526۔

[3] حوالہ در الاشقر، مقاصد، ص۔ 526۔

نہیں سنی اور محمد ابنِ ابراہیم نے یہ حدیث علقمہ سے نہیں سنی۔ لیکن ایسے کئی اقوال موجود ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ یہ راوی ایک دوسرے سے ملے ہیں اور براہِ راست ایک دوسرے سے احادیث روایت کیں ہیں۔[1]

کیا یہ حدیث متواتر ہے؟

دوسری انتہا پر کچھ لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ حدیث متواتر ہے، یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔ جیسا کہ اس حدیث کی معتبر روایات کا جائزہ لینے سے واضح ہو جاتا ہے، یہ سب روایات عمرؓ ← علقمہ ← محمد ابنِ ابراہیم ← یحییٰ کے سلسلہ سے ہو کر آتی ہیں، اس لیے یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ حدیث متواتر ہے۔ لیکن اگر اس سے مراد "اپنے معنوں میں متواتر"[2] ہونا ہے تو یہ بات مانی جاسکتی ہے۔ قرآن اور حدیث کے کئی حوالے اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں کہ "اعمال کا دارومدار نیّتوں پر ہے۔"

اس حدیث پر ایک جامع تبصرہ

یہ رسول ﷺ کی بہت جامع احادیث میں سے ایک ہے۔ یہ اسلام کے تقریباً تمام ہی اعمال سے تعلّق رکھتی ہے۔ ابو عبید کہتے ہیں کہ "رسول ﷺ نے ایک جملے میں دنیا کے تمام معاملات کا احاطہ کر دیا ہے""اگر کوئی شخص ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات شامل کرے جو اس دین میں نہیں تو ایسی بات مسترد کر دی جائے گی۔" اور رسول ﷺ نے ایک جملے میں آخرت کے تمام معاملات کا احاطہ کر دیا ہے" اعمال کا دارودمدار نیّتوں پر ہے۔" امام

---

[1] الاشقر، مقاصد، ص۔526۔

[2] " اپنے معنوں میں متواتر ہونا" یعنی بنیادی تصوّر اور معنی کا دوسری کئی روایت میں بھی موجود ہونا" اپنے الفاظ میں متواتر ہونا" یعنی بالکل یہی الفاظ دوسرے کئی سلسلوں سے بھی روایت ہونا۔

ابو داؤد کہتے ہیں کہ یہ حدیث نصف اسلام ہے: یعنی اسلام مجموعہ ہے ان اعمال کا جو ظاہر ہو جائیں اور ان اعمال کا جو ظاہر نہ ہوں، یعنی ان اعمال کے پیچھے پائی جانے والی نیّت۔ امام شافعی نے بھی کہا کہ یہ حدیث نصف علم ہے یعنی دین کا تعلّق دو اجزاء سے ہے ظاہر ی اور باطنی، بالترتیب اعمال اور نیّت اسکے ظاہری اور باطنی اجزا ہیں۔

امام احمد اور امام شافعی دونوں کہتے ہیں کہ یہ حدیث ایک تہائی علم پر محیط ہے۔ البیہقی نے اس جملے کی یوں تشریح کی یہ اس لیے کہ ایک شخص جزا حاصل کرتا ہے اپنے دل سے، اپنی زبان سے اور اپنے جسم سے، لہٰذا، ان تین میں سے ایک جُز کے ساتھ نیّت کا تعلّق ہے۔[1] امام شافعی نے یہ بھی کہا کہ یہ حدیث فقہ کے ستّر (70) عنوانات کا احاطہ کرتی ہے[2]۔"

امام احمد نے کہا کہ اسلام کی بنیاد تین احادیث پر ہے "اعمال کا دارو مدار نیّتوں پر ہے"، "اگر کوئی شخص ہمارے اس دین میں کوئی نئی بات داخل کرتا ہے جو اس دین میں نہیں تو ایسی بات مسترد کر دی جائے گی"، "حلال واضح اور حرام بھی واضح ہے۔"[3] امام ابو داؤد نے کہا کہ فقہ پانچ احادیث کے گرد گھومتی ہے۔ "اعمال کا داردو مدار نیّتوں پر ہے"، "دین اچھی نصیحت کا نام ہے"، "حلال واضح اور حرام بھی واضح ہے"، "خود کو نقصان پہنچانا اور کسی دوسرے کو نقصان پہنچانا دین میں نہیں"، "میں تمھیں جس بات سے روکوں اس سے رُک جاؤ اور جس بات کے کرنے کا حکم دوں اسے پورا کرو جتنا تم کرسکتے ہو۔"

ابو عبید[4] کہتے ہیں کہ "رسول ﷺ کی کوئی حدیث اس حدیث سے زیادہ جامع نہیں،

---

[1] دیکھیں ابنِ حجر، فتح الباری، جلد 1، ص۔ 11۔

[2] حوالہ در النووی، شرح صحیح، جلد 13، ص۔ 53؛ ابنِ رجب، جامی، ص۔ 5۔

[3] ابنِ رجب، جامی، ص۔ 5۔

[4] بعض جگہ یہ حوالہ ابو عبید سے منسوب ہے جبکہ دیگر مقامات پر یہ حوالہ ابو عبد اللہ سے منسوب کیا گیا ہے جس سے مراد امام

یہ اپنے اندر اتنی مکمل ہے کہ کسی حدیث کے متعلّق اتنے زیادہ ضروری نکات نہیں ہیں جتنے کہ اس حدیث کے متعلّق ہیں"۔[1]

تمام اچھے اعمال کی بنیاد اخلاص باللہ پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کتابیں نازل کیں، پیغمبر بھیجے اور اپنی مخلوقات کو صرف اپنی ہی عبادت کے لیے پیدا کیا۔ اس وجہ سے ہمارے کئی اسلاف اپنی مجالس اور اجتماعات کا آغاز اِسی حدیث سے کیا کرتے تھے، اِسی طرح بہت سے علما نے اپنی تصانیف اور مجموعوں کا آغاز اس حدیث سے ہی کیا، جیسا کہ امام البخاری اپنی صحیح کا آغاز اسی حدیث سے کرتے ہیں۔ عبد الرّحمٰن ابنِ مہدی کہتے ہیں "یہ ضروری ہے کہ جو کوئی کتاب لکھے اس کا آغاز اسی حدیث سے کرے تا کہ اس کے پڑھنے والوں پر نیّت کی درستگی کی اہمیت کو اُجاگر کیا جاسکے۔"[2]

وہ پس منظر جس میں یہ حدیث وارد ہوئی

جس طرح اسبابِ نزولِ قرآن (وہ حالات جن میں قرآن کی مختلف آیات نازل ہوئی ہوں) کا ایک علم (سائنس) ہے اِسی طرح اسبابِ ورودِ حدیث (وہ حالات جن میں اقوالِ رسول ﷺ وارد ہوئے ہوں)[3] کا بھی ایک علم ہے۔ اکثر اوقات وہ حالات جو قرآن کی کسی آیت کے نزول کے وقت رہے ہوں یا رسول ﷺ کی کسی حدیث کے ورود کے وقت موجود

البخاری ہوسکتے ہیں۔

[1] حوالہ در ابنِ حجر، فتح اُلباری، جلد 1، ص۔ 17۔

[2] حوالہ در النووی، شرح صحیح، جلد 13، ص۔ 53؛ ابنِ رجب، جامی، ص۔ 5۔

[3] اسبابِ ورودِ احادیث کے موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں جلال الدین السیوطی کی اسبابِ ورود الحدیث او سماء فی اسباب الحدیث (بیروت؛ دار الکتب العلمیہ، 1948)؛ ابراہیم ابنِ حمزہ الحسینی، البیان والتعریف فی اسباب ورود الحدیث الشریف (بیروت؛ المکتبہ العلمیہ، 1982)۔

ہوں اس آیت یا حدیث کے صحیح معنی سمجھنے کے لیے لازمی {مترجم کی رائے میں ان حالات کا جاننا اہم ہو سکتا ہے لیکن لازمی نہیں} ہوتے ہیں۔ وہ واقعات جو آیاتِ قرآنی اور احادیث رسول ﷺ کا احاطہ کیے ہوئے ہوتے ہیں ان آیات اور ان احادیث کی درست تشریح ان واقعات کی روشنی میں ہو سکتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی آیت یا حدیث کے کامل معنی و مفہوم جاننے کے لیے ان حالات کا تعیّن کرنا اہمیت رکھتا ہے۔ اس بات کا تعیّن کرنا اہم ہے کہ کیا کوئی خاص واقعہ کسی آیت کے نزول یا کسی حدیث کے ورود کا باعث بنا۔[1]

سعید ابنِ منصور اور الطبرانی، عبد اللہ ابنِ مسعودؓ کی سند پر بیان کرتے ہیں کہ یہ حدیث ایک ایسے شخص کی بابت وارد ہوئی جو اُمّ قیس نامی ایک خاتون سے نکاح کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اس رشتے پر رضامند نہیں تھیں جب تک کہ وہ مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ نہ آجائے۔ لہٰذا، یہ شخص اُمّ قیس سے شادی کی غرض سے ہجرت کر کے مدینہ آ گیا۔ ابنِ مسعودؓ کہتے ہیں "اس کے بعد یہ شخص اُمّ قیس کے مہاجر کے نام سے مشہور ہو گیا۔" ابنِ حجر کہتے ہیں کہ یہ بیان جس سلسلے سے آیا ہے وہ مستند ہے لیکن اس بیان سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ رسول ﷺ کا یہ قول کہ "اعمال کا دارومدار نیّتوں پر ہے۔" واضح طور پر اس واقعے کی وجہ سے وارد ہوا ہو۔ ابنِ حجر یہ ضرور مانتے ہیں کہ اس حدیث کا اطلاق اس شخص پر بھی ہوتا ہے لیکن غالباً یہ حدیث اس شخص کی وجہ سے وارد نہیں ہوئی۔[2]

---

[1] جیسا کہ اسبابِ نزولِ آیاتِ قرآن کا معاملہ ہے۔ اسی طرح ہر ایک حدیث کے لیے بھی یہ ضروری نہیں کہ کوئی واقعہ ہو جس کی وجہ سے حدیث وارد ہوئی ہو۔

[2] ابنِ حجر، فتح الباری، جلد 1، ص ص۔ 11-10۔

راوی عمرؓ ابن الخطاب کے بارے میں [1]

عمرؓ ابن الخطاب (39 قبل ہجری بمطابق 583 عیسوی تا 24 ہجری بمطابق 644 عیسوی) ابو بکر صدیقؓ کے بعد رسول ﷺ کے ایک عظیم المرتبت صحابی تھے۔ آپ بہت مضبوط اعصاب کے مالک اور مکّہ میں بہت معزز تھے۔ امام احمد بیان کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے ابو جہل یا عمرؓ ابن الخطاب میں سے کسی ایک کے ہدایت پر آنے کیلیئے دعا کی تھی۔[2] اللہ تعالیٰ کا فضل و رحمت کہ اس نے عمرؓ ابن الخطاب کو مشرّف بہ اسلام کیا، عمرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ ہجرت سے پانچ برس قبل کا ہے۔ ابنِ مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ عمرؓ کے اسلام لانے سے ہم بہت مضبوط ہوگئے اور اس کے بعد ہماری طاقت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔[3] عمرؓ نے رسول ﷺ کے ساتھ ہر غزوے میں شرکت کی۔

ابو بکرؓ کے بعد آپ خلیفہ ہوئے، فارس اور روم کی فتح آپ ہی کے زیرِ اَمارت ہوئی۔ اسلام کا دائرہ ایران اور مصر تک پھیلا اور نئی حکومت اور نئے معاشرے کی تشکیل کیلیئے اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ آپ قرآن و حدیث کا وسیع علم اور فقہ میں گہری نظر رکھتے تھے اور ایک عظیم مجتہد تھے۔

عمرؓ پر ایک غلام نے اس وقت خنجر سے وار کیا جب وہ فجر کی نماز کی امامت کر رہے تھے۔ یہ ایک عیسائی یا مجوسی غلام تھا جو عمرؓ کے کسی فیصلے کی وجہ سے ان سے نالاں تھا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد آپ کا وصال ہو گیا۔ عمرؓ ان عشرۂ مبشّرہ میں شامل ہیں جنہیں رسول ﷺ

---

[1] ان صحابہ کرام سے متعلّق عمومی معلومات جنہوں نے یہ حدیث روایت کی موجود ہیں، احمد ابنِ حجر، السعدۃ تمیز الصحابہ، (ریاض: مکتبہ الریاض الحدیث، 1978)۔

[2] دیکھیں ابراہیم العلی، صحیح السیرۃ النبویّۃ (اردن: دار النفع، 1995)، ص۔ 79۔

[3] اسے البخاری نے محفوظ کیا۔

نے جنّت کی بشارت دی تھی۔

عمرؓ کے اوصاف کا ذکر ہمیں رسول ﷺ کی کئی احادیث میں ملتا ہے۔ مثال کے طور پر رسول ﷺ فرماتے ہیں" 'جب میں سو رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ میں (دودھ) پی رہا ہوں اور میں اس قدر سیر ہو گیا کہ میں نے اس کی نمی اپنے ناخنوں سے نکلتی ہوئی محسوس کی اس کے بعد میں نے یہ دودھ عمرؓ کو دے دیا' لوگوں نے دریافت کیا' اس کی آپ کیا تعبیر کرتے ہیں' انہوں نے جواب دیا' یہ علمِ دین ہے'۔" (البخاری)

ایک اور موقع پر رسول ﷺ نے فرمایا" اے ابن الخطاب اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، شیطان اس راہ کو نہیں لیتا جس پر تمھیں پاتا ہے بلکہ وہ کوئی اور راہ لے لیتا ہے تمہاری راہ کے علاوہ" (البخاری)۔ ایک موقع پر آپ ﷺ ابو بکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کے ہمراہ اُحد کے پہاڑ پر تھے کہ پہاڑ لرزنے لگا تو آپ نے پہاڑ پر اپنا پیر مارا اور فرمایا" اے اُحد اپنی جگہ پر مستحکم رہ کہ تجھ پر کوئی اور نہیں ایک نبی، ایک صدیق اور ایک شہید موجود ہے۔" (البخاری)۔ {ہم نے البخاری کے نسخوں میں دو شہید لکھا پایا(مترجم)} آخری مثال کے طور پر یہ حدیث دیکھیے جس میں رسول ﷺ فرماتے ہیں" تم سے پہلے کئی اقوام میں ایسے لوگ تھے جن پر الہام ہوتا تھا لیکن وہ نبی نہیں تھے۔ اگر میرے اُمّتیوں میں ایسا کوئی ہو سکتا ہے تو وہ عمرؓ ہیں (صرف)۔" (البخاری)

عمرؓ نے رسول ﷺ سے کثیر تعداد میں احادیث روایت کیں۔ کُتبِ حدیث میں کم از کم پانچ سو تیس (530) احادیث عمرؓ کی سند پر موجود ہیں۔[1] عمرؓ نے اس بات کا خاص اہتمام کیا کہ دیگر صحابہ کرام احادیث روایت کرنے کے معاملے میں بہت محتاط رہیں۔ ایک موقع پر

---

[1] یہ احادیث کی وہ تعداد ہیں جو ان کی سند پر اہم مجموعہ ہائے احادیث میں پائی گئیں۔ البتہ یہ تعداد تمام تر صحیح احادیث پر مبنی نہیں ہے۔ تاہم، اس تعداد کا ذکر صرف اس بنا پر کیا ہے کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ مذکورہ صحابی نے کتنی زیادہ احادیث روایت کیں۔

انہوں نے ابو موسٰی الاشعریؓ کو دھمکایا کہ وہ ایک اور گواہ اس حدیث کے لیے لائیں جو ابو موسٰیؓ نے رسول ﷺ سے روایت کی تھی۔

عمرؓ کے مشرّف بہ اسلام ہونے کے متعلّق یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ وہ رسول ﷺ کو قتل کرنے کے ارادے سے نکلے تو کسی شخص نے انہیں بتایا کہ عمرؓ کی بہن بھی اسلام لے آئی ہیں، اس پر انہوں نے پہلے اپنی بہن کے گھر جا کر اس کی خبر لینے کا فیصلہ کیا۔ اپنی بہن کے گھر پہنچنے پر انہیں گھر کے اندر سے تلاوتِ قرآن سنائی دی۔ عمرؓ کے گھر میں داخل ہونے سے قبل ان لوگوں نے قرآن چھپا دیا، عمرؓ کے اصرار کرنے کے باوجود جب ان کی بہن نے انہیں قرآن نہیں دکھایا تو انہوں نے غصے میں آکر اپنی بہن کو مارا جس سے ان کے سر سے خون بہنے لگا، عمرؓ اس پر غمگین اور جذباتی ہو گئے۔ عمرؓ نے دوبارہ اس کو دیکھنے کی خواہش کی جسے یہ لوگ پڑھ رہے تھے۔ جس پر ان کی بہن نے یہ شرط لگائی کہ اگر وہ اسے ہاتھ لگانا چاہتے ہیں جو یہ پڑھ رہے تھے تو اس کے لیے انہیں غسل کرنا ہو گا۔ عمرؓ نے ایسا ہی کیا اور واپس آکر انہوں نے قرآن پڑھا جس کا ان کے دل پر اثر ہوا اور وہ ایمان لے آئے۔ بد قسمتی سے یہ واقعہ مصدّقہ نہیں، کہ یہ روایت کسی مستند سلسلے سے نہیں ملتی۔[1] {مزید یہ کہ عمرؓ کی بہن کا عمرؓ کے غسل کرنے کی شرط لگانا اس سے قبل کہ وہ قرآن کو چھوئیں سمجھ میں نہیں آتا، کیونکہ ایک مشرک اسلامی نقطۂ نظر سے اگر کسی کام کے لیے نجس تصوّر کیا جاتا ہے تو وہ غسل کر لینے سے پاک نہیں ہو جاتا (مترجم)}۔

---

[1] حوالہ در العلی، ص۔80؛ اکرم العمری، السیرۃ النبویہ الصحیحین مدینہ: مکتبہ العلوم والحکم، 1993، جلد1، ص۔180۔

یقیناً، اعمال کا دارومدار نیّتوں پر ہے اور ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیّت کی۔

اس مقام سے ایک طویل بحث کا آغاز ہوتا ہے، اس بحث کا مقصد مذکورہ حدیث کے مندرجہ بالا حصہ کے صحیح مفہوم تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ مختلف ادوار میں اصحابِ علم نے اس ضمن میں جو روش اختیار کی اس سے الجھاؤ پیدا ہوا ہے اور شاید اسے سمجھنا بہت آسان نہ ہو۔ لہٰذا، وہ قارئین جو حاصلِ بحث پر ہی اکتفا کرنا چاہتے ہوں تفصیلی بحث سے احتراز کرتے ہوئے بحث کے اواخر میں دیئے گئے خلاصے "خلاصہ، یقیناً تمام اعمال کا دارومدار۔۔۔" کو دیکھ لیں۔

اِنّما کے معنی

"اِنّما" تاکیداور تخصیص کا مظہر ہے اور اس بنا پر ترجمہ یوں کیا جاسکتا ہے "یقیناً (درحقیقت) صرف۔۔۔" ماہرینِ لسانیات اور علمائے قواعداس امر میں اختلاف کرتے ہیں کہ اِنّما کی نوعیّت کیا ہے، یہ اختلاف اس کے ماخذ اوراُس ترکیب کی بنا پر ہے جس میں اِنّما کا لفظ استعمال ہوا ہو۔ اہم بات یہ ہے کہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ اِنّما بالعموم تخصیص کو ظاہر کرتا ہے، اس رائے سے مستثنیات ہوسکتی ہیں۔ اس بنا پر حدیث کے زیرِ بحث حصے کا ترجمہ یوں ہو گا "یقیناً اعمال کا دارومدار نیّتوں پر ہے" نہ کہ "اعمال کا دارومدار نیّتوں پر ہے"، کیونکہ ایسا ترجمہ مکمل نہیں ہو گا۔ دراصل ہر عمل کی بنیاد اس کی پشت پر موجود نیّت ہی پر ہوتی ہے اور اس اُصول سے کوئی عمل مستثنیٰ نہیں۔

اِنّما کے استعمال میں تخصیص ظاہر ہونے سے مراد یہ ہے کہ بیان کیے گئے حکم کا اطلاق اُسی چیز پر ہوتا ہے جس کے بارے میں بیان کیا گیاہو اوراس کے سوا کسی چیز پر نہیں

ہوتا۔ آیاتِ قرآن سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اِنّما کے یہ ہی معنی ہیں۔ قرآن میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں آیات کے ایسے جوڑے ہیں جو ہم معنی ہیں لیکن ان میں سے ایک آیت میں اِنّما آیا ہے اور دوسری میں اِلّا "سوائے" کا لفظ آیا ہے۔ مثلاً، اللہ تعالیٰ قرآنِ پاک میں فرماتے ہیں،

اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔

"تمہیں تو ویسا ہی بدلہ دیا جارہا ہے جیسے تم عمل کر رہے تھے۔" (التحریم:7)

وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔

"اور تمہیں جو بدلہ بھی دیا جارہا ہے انہی اعمال کا دیا جارہا ہے جو تم کرتے رہے ہو۔" (الصّٰفّٰت:39)

یہاں پر ماہرینِ لسانیات اور علمائے قواعد اس بات پر اختلاف کرتے ہیں کہ آیا یہ تخصیص لفظی طور پر لی جائیگی (حقیقی) یا لفظی طور پر نہیں لی جائیگی (مجازی)۔ ابنِ عطیّہ کہتے ہیں کہ اس سے حقیقی تخصیص مراد نہیں لیکن ان کے اس خیال سے جمہورِ علماء نے اختلاف کیا ہے۔[1] یہ اختلاف اس نتیجے کی شکل میں سامنے آتا ہے:

ابنِ عطیّہ کے مطابق جب اِنّما استعمال ہو تو اس کے مخصوص ہونے کیلئے یہ لازم ہے کہ اس پر کوئی واضح دلیل موجود ہو۔ جبکہ دیگر اصحابِ علم کے مطابق اِنّما تخصیص کے لیے ہی سمجھا جائے گا الّا یہ کہ اس کے برعکس کوئی دلیل موجود ہو جو یہ ثابت کرے کہ تخصیص موجود نہیں۔ لہٰذا، یہ دونوں نقطہ ہائے نظر ایک دوسرے کے برعکس ہیں۔

یہاں احتیاط سے کام لیتے ہوئے یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ایک صورت "مشروط

---

[1] حوالہ در الشنقیطی، کوثر، جلد1، ص۔134۔

تخصیص" کی بھی ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کی اس آیت کو دیکھیں:

إِنَّمَآ أَنتَ مُنذِرٌ۔

"تم تو محض خبر دار کر دینے والے ہو۔" (الرعد:7)

یہاں مشروط تخصیص کا معاملہ ہے یعنی رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خبر دار کرنے والے ضرور ہیں لیکن ان کی یہ صِفت صرف انکار کرنے والوں کے لیے ہے۔ جو نہ ان پر ایمان لاتے ہیں اور نہ ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کی وہی ایک صِفت ہے بلکہ آپ اس کے سوا اور بھی صِفات رکھتے ہیں۔ ایمان لانے والوں کے لیے آپ خوشخبری سنانے والے ہیں اور آپ ایک مثال ہیں پیروی کیلیئے، ایک اور آیت سورۃِ محمد کی ایسی ہے جس کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے:

إِنَّمَا الْحَيَوٰةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ۔

"یہ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور تماشا ہے۔" (محمد:36)

اس آیت کا اطلاق صرف ان لوگوں پر ہوتا ہے جن کو دنیا نے اپنے قابو میں کر لیا ہو اور ان کی تمام خواہشات دنیا ہی تک محدود ہو کر رہ گئی ہوں وگرنہ دنیا تو آخرت کی تیاری کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔

(الاعمال) تمام اعمال

حدیث میں موجود یہ لفظ عمل یا" کام" کی جمع ہے اور اس حدیث میں یہ لفظ ال سے شروع ہوتا ہے، اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ ایک عمومی اصطلاح ہے جس میں تمام اعمال اس کے ممکنہ معنوں میں شامل ہیں۔[1] یعنی اس میں بدنی اور لسانی اعمال، فرض اور نفل

---

[1] ایک عمومی اصطلاح جو احاطہ کرتی ہے ان تمام چیزوں کا جو اس کے معنی میں شامل ہیں۔ البتہ اسے تخصیص کے ساتھ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے؛ جیسے کہ مستثنیات کے ساتھ، اس حدیث میں یہی معاملہ ہے ۔ جہاں زبر دستی کرائے گئے، اعمال کو استثنا حاصل ہے۔

اعمال، چھوٹے اور بڑے اعمال سب شامل ہیں۔ کچھ لوگ لسانی اعمال کو اس سے خارج سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک بیان کو اعمال میں شامل کرنا درست نہیں۔ ابنِ دقیق العید اس رائے کو چونکا دینے والی اور دور کی کوڑی کہتے ہیں۔[1] الشنقیطی کہتے ہیں کہ بیان کو استعاراتی طور پر عمل ہی کہا جائے گا۔

البتہ، بہت سے علمااس حدیث کے دائرے کو ذمہ دار مومنین کے اعمال تک محدود کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ حدیث اشارہ کرتی ہے اعمالِ عبادت کی طرف اور عبادات صرف ذمہ دار مومنین ہی سے مناسبت رکھتی ہیں۔ کچھ لوگ اس کو صرف اعمالِ شریعہ کیلئے مخصوص سمجھتے ہیں یعنی صرف عبادات اور قانونی معاملات کیلئے۔ بہر حال ایسا کوئی واضح ثبوت موجود نہیں جس کی بنا پر اسے صرف مومنین کے اعمال تک محدود سمجھا جائے۔ مزید یہ کہ اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ اس حدیث کو صرف عبادات اور اعمالِ شریعہ کیلئے مخصوص سمجھا جائے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ ہوش وحواس میں اِرادی طور پر کیے گئے اعمال تک اس حدیث کے اطلاق کو محدود کیا جاسکتا ہے۔ کبھی اعمال غیر اِرادی طور پر کسی مقصد کے بغیر بھی سرزد ہو جاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسے اعمال بغیر نیّت کے ہوئے ہیں اس لیے ایسے اعمال اس حدیث کے تحت نہیں آتے۔

حرف ب (با)

عربی زبان میں حرف ب (با) کے کئی معنی ہیں۔ زیرِ بحث حدیث میں رسول ﷺ نے فرمایا "یقیناً اعمال کا دارومدار نیّتوں پر ہے" یہاں حرف "ب" کی کئی تشریحات ہیں، پہلی

---

[1] حوالہ در الشنقیطی، کوثر، جلد1، ص۔134۔

تشریح کے مطابق یہ "ب"" بالمُصاحِبہ" یا مربوط ہے اس صورت میں حدیث کے معنی یوں ہوں گے "اعمال مربوط ہیں نیّتوں کے ساتھ۔"

ایک دوسری تشریح حرف "ب" کی یہ ہے کہ یہ "ب" "سببیہ" ہے یعنی وجہ یا سبب ظاہر کرتا ہے۔اس صورت میں حدیث کے معنی یوں ہوں گے کہ اعمال نیّتوں کی "بنا" پر ہوتے ہیں۔ امام العینی اس سے یکسر اختلاف کرتے ہیں جبکہ الشنقیطی کہتے ہیں کہ یہ دونوں ہی ممکنہ تشریحات ہوسکتی ہیں۔اگر اسے درست مان لیاجائے تواس کے یہ معنی نکلیں گے کہ جزا کی تصدیق نیّت سے ہی ہوتی ہے کیونکہ یہ نیّت ہی ہے جس کی وجہ سے اولاً عمل وجود میں آتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ مضبوط رائے ہے اور زیرِ مطالعہ تشریح میں اسی رائے کو تسلیم کیا گیاہے۔

العینی کے مطابق، الکرمانی رقم طراز ہیں کہ یہ مختلف نوعیّت کا "ب" ہے جسے "ب" بالاستعانہ (ایسا "ب" جس کا استعمال مدد کے لیے ہے) کہا جاتا ہے،اس بناپر ترجمہ یوں ہو گا۔"اعمال نیّتوں کی مدد سے سرزد ہوتے ہیں۔" شارحینِ حدیث کی اکثریت اس رائے پر نہ ہی نگاہ کرتی ہے نہ اسے قابلِ توجّہ سمجھتی ہے۔[1]

"النّیّہ" نیّت کے معنی

اس حدیث پر بحث کا ایک اہم پہلو "النّیّہ" کے معنی میں مضمر ہے۔ صالح السدلان نے اس لفظ "النیّہ" نیّت کے لسانی ماخذ کے ضمن میں تبصرہ کرتے ہوئے لفظ نیّت کی کچھ یوں وضاحت کی ہے،

> اصلاً نیّت کا مفہوم بعض کی نظر میں کسی چیز کی جستجو کرنا اور بعض کی نظر میں جستجو میں سنجیدہ ہونا ہے۔مثال کے طور پر عبد اللہ ابنِ مسعودؓ نے ایک موقع پر فرمایا "جو

---

[1] محمود الاعینی، عمدہ القاری شرح صحیح البخاری، (بیروت: دار الطرح العربی، تاریخ ندارد)، جلد 1، ص۔ 24۔

اس دنیاوی زندگی کی نیّت کرے گا وہ اسے نہ پاسکے گا" یعنی بہت سنجیدگی سے اس کی جستجو کرنا، اس کی دلی تمنا کرنا، اور کچھ لوگوں کا کہنا ہے دل میں اس کا عزم موجود ہونا۔ ایک اور خیال یہ ہے کہ یہ لفظ النوی سے ہے جس کے معنی فاصلے کے ہیں یعنی کچھ کرنا یا حاصل کرنا موجودہ صورت میں جوارح کے دائرۂ اختیار میں نہیں اور اس کیلئے کچھ فاصلہ طے کرنا ضروری ہے۔ سو، ایسی چیز یا ایسے عمل کیلئے دل میں مقصد کا ہونا نیّت کے مترادف ہے۔ یعنی اس نیت کی بنا پر ہی کوئی شخص یہ ہدف حاصل کرے گا۔ ابنُ القیّم الجوزیہ نیّت کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ عمل کرنے والے کا علم اس(عمل) کے بارے میں اوراس کی پشت پر موجود مقصد کا واضح ہونا۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی دباؤ کے بغیر ایک ذی عقل کا عمل اس کے بغیر نہیں ہوسکتا کہ وہ اس عمل کا تخیّل کرتا ہے اور اپنے اندر اسے کرنے کی خواہش کرتا ہے۔ یہ کسی ایسی چیز کا نام نہیں جو اس کے دائرۂ تخیّل سے باہر ہو یا اس کے متعیّن مقصد سے باہر ہو۔۔۔ السیوطی کہتے ہیں کہ "نیّت وہ قوّت ہے جو اس خواہش سے مطابقت رکھتی ہے جو ایک عمل کے کرنے کی نسبت سے کسی کے دل میں موجود ہو۔ یہ کسی اچھے عمل کیلئے ہو یا کسی نقصاندہ عمل کیلئے، حاضر سے متعلّق ہو یا مستقبل سے"۔[1]

نیّت کا لفظ{اردو زبان میں} کاوش، ارادہ، مقصد، قصد، عزم، ہدف، قراردار، پختہ ارادہ اور ایسے کئی اور معنی لیے ہوئے ہے۔ یہ صرف ایک خواہش کا نام نہیں جو کسی کے دل میں پیدا ہو بلکہ اس کے لیے مضبوط ارادہ اور اس کو پورا کرنے کی جستجو نیّت کے مفہوم میں شامل

---

[1] السدلان، النّیّتہ، جلد1، ص ص۔99-98۔

ہیں۔ اس بنا پر اگر کوئی شخص ایک عمل کرنے کی نیّت کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ یہ عمل کرے گا جب تک کہ اسے اس عمل کے کرنے سے روکنے والی کوئی چیز موجود نہ ہو۔ مثال کے طور پر کوئی شخص پیر کے دن روزہ رکھنے کی نیّت کرتا ہے تو وہ یہ روزہ رکھے گا اگر کوئی صورت ایسی نہ ہو جو اس عمل سے اسے روکے، لیکن اگر وہ بغیر کسی رکاوٹ کے روزہ نہیں رکھتا تو یہ کہا جائے گا کہ پیر آنے پر اس کی روزہ رکھنے کی نیّت نہیں تھی۔

یہ تو لفظِ نیّت کے معنی لسانی اعتبار سے ہوئے، مزید یہ کہ ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ شرعی اعتبار سے اس کے معنی مختلف ہوں، ہاں یہ ضرور ہے کہ فُقہا اس لفظ کو ایک دوسرے انداز سے استعمال کرتے ہیں اور نیّت کے متعلّق یہ کہتے ہیں کہ اس کا دل میں موجود ہونا کسی بھی عملِ عبادت کیلئے ضروری ہے۔

نیّت کا مسکن

ابنِ تیمیہ کہتے ہیں اہلِ علم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ "نیّت کا مسکن" دل یا ضمیر ہے اور زبان نہیں[1] اس کے معنی یہ ہوئے کہ زبان سے کہہ دینا کسی کام کو کرنے کی نیّت کے مترادف نہیں۔ لہٰذا، زبان سے کہنے کی بدعت جیسا کہ یہ کہنا کہ "میں نے دو رکعت کی نیّت کی" سمجھ سے بالاتر ہے، رسول ﷺ ایسا نہیں کیا کرتے تھے۔[2]

مثلاً رسول ﷺ کی یہ حدیث جس میں آپ ﷺ فرماتے ہیں،

من لم یبیت الصیام من اللیل فلا صیام لہ۔

"جو شخص رات میں رمضان کے روزے (اگلے دن کے) کی نیّت نہ کرے اس کیلئے

---

[1] حوالہ در الاشقر، مقاصد، ص۔115۔

[2] واحد ممکنہ استثنا حج کو حاصل ہے۔ علمانے اس پر بحث کی ہے کہ یہ استثنا کیوں ہے۔ دیکھیں السدلان، النّیّتہ، جلد2، ص ص۔29-28۔

اس روزے کا اجر نہیں ہے۔"[1]

اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص کو معلوم ہے کہ اگلے دن رمضان ہے اور اسے معلوم ہے کہ رمضان کا روزہ اس پر فرض ہے تو وہ اس کا قصد کرے کہ وہ یہ روزہ رکھے گا تو اس کی "نیّت" ہوگئی۔ لیکن اگر یہ شخص زبان سے کہے کہ میری یہ نیّت ہے کہ میں کل کا روزہ رکھوں گا مگر دل میں ایسا کرنے کا ارادہ نہیں تو اس کی "نیّت" نہیں ہوئی۔ لہٰذا، نیّت کی مناسبت سے جو چیز اہم ہے وہ یہ ہے کہ اس کے دل میں کیا ہے۔

بعض اصحابِ علم کی رائے یہ ہے کہ کسی عمل سے پہلے آہستہ سے زبان سے اپنی نیّت کا بیان کر دینا "مستحب" یا بہتر ہے۔ اس رائے کے حامل اصحابِ علم اس بات کے قائل ہیں کہ نیّت کا اصل مسکن دل ہی ہے لیکن زبان سے اس کا اظہار کرنے والا شخص دل کے اندر موجود نیّت سے اپنے آپ کو مزید آگاہ کرلیتا ہے۔ یہ کہنا کہ ایسا کرنا "مستحب" ہے ایک شرعی فیصلہ ہے۔ کسی عمل کو مستحب نہیں کہا جاسکتا جب تک اس پر قرآن وسنّت سے کوئی دلیل موجود نہ ہو۔ کیونکہ آہستہ سے نیّت کے بیان کرنے پر ایسی کوئی دلیل موجود نہیں، لہٰذا، یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ ایسا کرنا مستحب ہے۔[2]

اس ضمن میں امام شافعی کے ایک بیان کی غلط تشریح کی گئی ہے جس سے یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ امام شافعی نے کہا کہ کسی عمل کی، مثلاً نماز کی نیّت کو زبان سے ادا کرنا بہتر ہے۔ جو امام شافعی نے فرمایا ،وہ یہ ہے کہ نماز کی اور حج میں احرام کی نیّت کے درمیان جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ نماز ایک بیان سے شروع ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے یہ خیال کیا کہ بیان سے مراد نیّت کا زبان سے ادا کرنا ہے لیکن ایسا خیال کرنا غلط ہے۔ درحقیقت ان کا اشارہ تکبیر کی

---

[1] ان الفاظ کے ساتھ نسائی نے قلمبند کیا، بمطابق الالبانی یہ صحیح ہے، الالبانی، صحیح الجامع، جلد2، ص۔114۔

[2] دیکھیں الاشقر، مقاصد، ص ص۔126-125۔

طرف ہے جو نماز شروع کرتے وقت پڑھی جاتی ہے۔[1]

نیّت کے ہم معنی الفاظ[2]

یہ صحیح ہے کہ نیّت اور اس لفظ سے ماخوذ کئی الفاظ احادیث میں جگہ جگہ ملتے ہیں۔ قرآن میں اس ضمن میں نیّت سے مختلف الفاظ آئے ہیں ان میں "الارادۃ" "القصد" "العزم" شامل ہیں۔ یہ الفاظ اپنے معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک چند مخصوص پہلو رکھتا ہے جو انہیں ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں۔ یہ سب الفاظ ایسی خواہش کو ظاہر کرتے ہیں جو کچھ کرنے یا حاصل کرنے یا کچھ نہ کرنے کے سلسلے میں پیدا ہوتی ہے۔ در حقیقت یہ سب الفاظ عربی زبان میں ایک ہی معنوں میں مستعمل ہیں۔

القرادائی کے مطابق نیّت ارادے کے ذیل میں آتی ہے۔ نیّت، قرارداد، اہمیت دینا، خواہش کرنا، مقصد، منتخب کرنا اور رضا سب ارادے کے دائرے میں آتے ہیں اور ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مسکن دل میں ہے۔ اس کا اظہار قرآن کی مندرجہ ذیل آیات میں ہوا ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا۔ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا۔

"جو کوئی (اس دنیا میں) جلدی حاصل ہونے والے فائدوں کا خواہشمند ہو، اسے یہیں ہم دے دیتے ہیں جو کچھ بھی جسے دینا چاہیں، پھر اس کے مقسوم میں جہنم لکھ دیتے ہیں جسے وہ تاپے گا ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہو کر۔ اور جو آخرت کا خواہشمند ہو اور اس کے لیے

---

[1] دیکھیں ابنِ تیمیہ، مجموعہ، جلد 18، ص۔ 262۔

[2] دیکھیں السدلان، النّیّتہ، جلد 1، ص ص۔ 111-107۔

سعی کرے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے، (شایانِ شان کوشش کرتا ہے)اور ہو وہ مومن، تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور (مقبول) ہو گی۔"(بنی اسرائیل:19-18)

قصد یا مقصد کا مفہوم کسی کی جانب رُخ کرنا اور اس کی تمنّا کرنا ہے۔ یہ نیّت کے ہم معنی اصطلاح کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ دراصل یہ معنی کے اعتبار سے نیّت کے بہت قریب ہے۔ لیکن یہ اپنے لیے کسی چیز کی تمنا کرنے یا کسی اور کیلئے کسی چیز کی تمنّا کرنے کیلئے استعمال ہو سکتا ہے جبکہ نیّت کا لفظ اپنے لیے تمنّا کرنے کیلئے استعمال نہیں ہوتا۔

ثانیاً، قصد کا استعمال محدود ہے ایسے اعمال کیلئے جن کے کرنے کی صلاحیت کسی شخص میں موجود ہو جبکہ نیّت کا لفظ ایسے اعمال کیلئے بھی استعمال ہو سکتا ہے جن کا کرنا چاہے نیّت کرنے والے کی استطاعت سے باہر ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً، ایک شخص یہ نیّت کرے کہ اگر اس کے پاس ایک خاص مقدار میں دولت ہو گی تو وہ سب خرچ کر دے گا۔ یہ اس کی نیّت تو ہو سکتی ہے لیکن یہ اس کے اختیار میں نہیں ہے کیونکہ اس کے پاس اتنی دولت موجود نہیں۔ اس طرح کے معاملے میں نیّت کا لفظ تو استعمال ہو سکتا ہے لیکن قصد کا نہیں۔

تیسرا لفظ عزم کا ہے یہ دل کا یقین ظاہر کرتا ہے کسی کام کے کرنے کیلئے۔{باالفاظ دیگر اس لفظ کا مفہوم پختہ ارادہ بھی ہو سکتا ہے(مترجم)} عزم کا لفظ ہمیں قرآن میں ملتا ہے اور وہاں یہ چار معنوں میں استعمال ہوا ہے: مقصد، صبر، قرارداد اور تکمیل، یہ کسی کام کو کرنے کی یقینی خواہش کو بھی ظاہر کرتا ہے جس میں کوئی ہچکچاہٹ یا شک نہ ہو۔ ان تمام اصطلاحات میں ایک مضبوط خواہش کے ضمن میں عزم سب سے زیادہ بھرپور ہے۔ درحقیقت نیّت، خواہش اور مقصد ان سب سے آگے عزم ہے اور ان سب کا نقطہ ٔمعراج ہے۔

نیّت، قصد اور ارادہ ان سب کیلئے علم کا اور عمل کا ہونا ضروری ہے۔ سب سے پہلے اس کا علم ہونا ضروری ہے جس کام کو کرنا ہو اس کے بعد عمل کا ہونا ضروری ہے یہاں تک کہ کوئی

چیز اس کے کرنے میں مانع نہ ہو۔ سو، یوں کہا جاسکتا ہے کہ کوئی بھی عمل اس وقت تک مکمل تصوّر نہیں کیا جائیگا جب تک اس کے یہ لازمی اجزائے ترکیبی موجود نہ ہوں، یعنی اس کام کا علم، عمل، اس کے کرنے کی لگن اور اس کے کرنے کی صلاحیت۔ کوئی ایسے عمل کے بارے میں سوچ نہیں سکتا جس کے بارے میں اسے علم نہ ہو اور وہ ایسا عمل کر نہیں سکتا جس کی صلاحیت اس میں موجود نہ ہو۔

جب ایسے کام کی نیّت ہو جو فوراً سرزد ہونے والا ہو تو یہ نیّت قصد کے زُمرے میں آئے گی۔ اگر یہ نیّت ایسے عمل کی ہے جو مستقبل میں ہو گا تو ایسی نیّت عزم کے زُمرے میں آئیگی۔ ارادہ حال اور مستقبل دونوں اقسام کے اعمال پر منطبق ہو گا۔[1]

نیّت اور اخلاص

کسی شخص کی نیّت نیک یا بد ہو سکتی ہے۔ ایک مومن کا یہ مطمحِ نظر ہونا چاہیے کہ اس کی نیّت یعنی کسی عمل کو کرنے کی تحریک خالصتاً اللہ ہی کیلئے ہو۔ اخلاص ایک اہم قرآنی اصطلاح ہے۔ یہ توحیدِ خالص کا ایک اہم جُزہے جس کی تعلیم تمام انبیاء نے اپنی اُمتّوں کو دی۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں،

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ۔

"اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے بالکل یکسو ہو کر، نماز قائم کریں اور زکٰوۃ دیں، یہی نہایت صحیح اور

---

[1] ایسے دیگر الفاظ جو نیّت سے معنی میں مشابہ ہیں لیکن یہاں ان کا ذکر نہیں کیا گیا، الحم، شاء، المیل، ہوا، شھی، ظن، عن، رغب، الماحس، الخاطر، حدیث النفس ابتغی ان اصطلاحات کے متعلّق بحث کے لیے دیکھیں السدلان، النیۃ، جلد1، ص ص۔126-115۔

درست دین ہے۔"(البیّنۃ 5:)

عبادت کے کسی بھی عمل سے قبل یہ ضروری ہے کہ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ یہ عبادت خالص اللہ ہی کیلئے ہے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں یا تو ایک شخص کوئی بڑا شرک کرے گا اور دائرۂ اسلام سے خارج ہو گا یا کم از کم ایک کمتر نوعیّت کا شرک اس سے سرزد ہو گا۔

کیا جملے سے کوئی چیز حذف کر لی گئی ہے؟

تعارّفی بحث

عربی زبان کا یہ عام اُسلوب ہے کہ کسی جملے میں سے کچھ حذف کر لیا جائے، اس طرح کا اُسلوب انگریزی زبان میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً وہاں اسے Elipsis کہتے ہیں جس کی تعریف کچھ یوں ہے"جملے میں سے کسی ایسے لفظ یا الفاظ کو حذف کر لینا جس کے ہونے سے جملے کی تشکیل مکمل ہو اور جملہ واضح ہو جائے"[1] عربی زبان میں اس کی ایک سے زیادہ صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اس کی ایک شکل جو اِضمار "دبانا یا زیر کرنا" کہلاتی ہے انگریزی کے Elipsis کے متوازی ہے۔ اس کی ایک اور صورت تقدیر ہے جس میں حذف کردہ لفظ یا الفاظ کو تصوّر کر لینا یا ان کا مضمر ہونا ضروری ہے۔

عام طور پر جملوں میں اِضمار یا تقدیر کی موجودگی کا سہارا نہیں لینا چاہیے یعنی جملے کو اسی طرح سمجھنے کی سعی کی جائے جیسا کہ وہ ہے، لیکن مطلب نہ واضح ہونے کی صورت میں اضمار یا تقدیر کے پیرائے میں جملے کا مطلب سمجھا جائے گا۔ اِضمار کا استعمال اور تقدیر کی طرف رجوع کرنا عربی کلام کا حصہ ہیں۔ اس کی مثالیں قرآن میں ملتی ہیں ان میں زیادہ تر تقدیر کا معاملہ نظر

---

1 Webster's Encyclopedia Unabridged Dictionary of the English Language, (Newyork: Portland House 1989), p.464.

آتا ہے جس میں حذف کیے گئے لفظ یا الفاظ کی جگہ کچھ تصوّر کرنا ضروری ہے۔ جبکہ:

(ا) جملہ درست یا سچ نہیں ہو گا اگر اضافی طور پر کچھ ایسا تصوّر نہ کیا جائے جو اس جملے کے معنی کی تکمیل کرے، مثلاً یہ حدیث،

ان اللہ وضع عن امتی الخطا والنسیان وماستکرھو علیہ۔

"میری اُمّت سے ہٹا لیے گئے خطا، بھول چوک اور جبر کے تحت کیے گئے اعمال۔"[1]

اس بیان کو اس کی ظاہری شکل میں نہیں لیا جا سکتا کیونکہ ایسے اعمال اُمّت میں سرزد ہوتے رہتے ہیں اس لیے موجود ہیں اور ہٹائے نہیں گئے۔ اس بنا پر حدیث کا مفہوم یقیناً یوں ہو گا کہ ان اعمال کے احکام اور سزا ہٹا لیے گئے یا یہ کہ ایسے اعمال کا گناہ ہٹا لیا گیا۔[2]

(ب) جملے کا عقلی امکان نہیں بنتا جیسا کہ سورۃ یوسف کی آیت نمبر 82 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

واسال القریۃ۔

اس کے لفظی معنی ہوں گے "شہر سے پوچھو۔" ایک شہر بات نہیں کرتا اس لیے "شہر کے باسی" جیسے الفاظ کو تصوّر کیا جائے گا یعنی جملے کے معنی یوں ہوں گے "شہر کے باسیوں سے پوچھو" جیسے {اردو زبان میں} یہ کہنا کہ میں نیویارک سے رابطہ کر رہا ہوں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ نیویارک میں کسی شخص سے رابطہ کر رہا ہوں۔

(پ) شرعی اعتبار سے جملہ درست نہ ہو۔ مثلاً قرآن کی آیت (النساء:23) میں ہے،

---

[1] یہ اربعین النوویہ کی حدیث نمبر 37 کا ایک مختلف متن ہے۔ مذکورہ بالا متن، ابنِ نُعیم نے قلمبند کیا۔ آگے چل کر یہ بتایا گیا ہے کہ اس متن میں نقص ہے۔

[2] عمومی طور پر پہلی تفسیر شافعی مسلک سے جبکہ دوسری حنفی مسلک سے تعلّق رکھتی ہے۔ حدیث نمبر 39 کی تفسیر میں اس پر تفصیل سے بحث کی جائیگی۔

حرمت علیکھم امھاتکم۔

اس کے لفظی معنی ہوں گے ”تمہاری مائیں تم پر حرام ہیں۔“ لیکن کوئی شہ اپنے تیئں حرام نہیں ہوتی۔ جو حرام ہوتا ہے وہ عمل ہوتا ہے جو کسی شے کی نسبت سے کیا جائے۔ اس لیے یہ آیت واضح طور پر یہ معنی رکھتی ہے ”تمہاری مائیں تم پر حرام ہیں نکاح کیلئے“{بالکل یہی اُسلوبِ بیان اردو زبان میں بھی ملتا ہے۔} اگر یہ کہا جائے کہ ”شراب حرام ہے“ تو اس کے معنی یہ نہیں کہ شراب کا مادّہ حرام ہے بلکہ اس کے معنی یہ تصوّر کیے جائیں گے کہ اس سے متعلّق افعال ”اس کا پینا حرام ہے“، ”اس کا بیچنا حرام ہے“، ”اس کا بنانا حرام ہے“ یا شراب سے متعلّق معاونت حرام ہے۔

(ت) قواعدِ لسانی کا تقاضا ہے کہ جملے میں اضافہ کیا جائے۔ یہ اضمار کی صورت ہو گی۔

ایک بار پھر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ تقدیر یا کسی ایسے لفظ یا الفاظ کا تصوّر کر لینا جو جملے میں موجود نہیں کوئی عام قاعدہ نہیں ہے الّا یہ کہ اس کے سوا گزارہ نہ ہو۔ یعنی قاعدہ یہ ہے کہ جملے مکمل ہوتے ہیں، جن میں وہ تمام الفاظ موجود ہوتے ہیں جو جملوں کی تکمیل کیلئے ضروری ہوتے ہیں۔ صرف جہاں یہ معاملہ نہ ہو جیسا کہ اوپر دی گئی مثالوں سے واضح کیا گیا ہے؛ ایسی صورت میں یہ تصوّر کیا جائیگا کہ جملے سے کچھ حذف کیا گیا ہے۔ حنفی مکتبہٗ فکر کے مطابق کیونکہ ایسا اشد ضرورت کے تحت ہی کیا جائیگا اس لیے اس میں ایسی چیز تصوّر کی جائے گی جو کم سے کم ہو اور اس محدود اضافے سے جملہ مکمل ہو جائے۔ دیگر لوگوں کا خیال ہے کہ ایسی چیز تصوّر کی جائے گی جو معنی کے لحاظ سے جملے میں بیان کیے گئے الفاظ سے قریب تر ہو۔ مثلاً اگر کسی چیز سے محروم رکھا جائے یا منع کیا جائے تو اس پوری چیز کا حرام یا منع ہونا تصوّر کیا جائے گا جیسا کہ مذکورہ حدیث میں ہے۔[1]

---

[1] احناف اور دیگر کے مابین جو اختلاف موجود ہے وہ اسلامی اُصولِ فقہ کی تحریروں میں ملتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیں فتح

{اس ضمن میں بحث کا خلاصہ اوپر پیش کر دیا گیا ہے۔ اصل مضمون کی روانی کو بر قرار رکھنے کے پیشِ نظر تقدیر اور اضمار پر مزید تفصیل کو اس حدیث کی تفسیر کے اختتام پر ضمیمہ نمبر 1 میں پیش کیا گیا ہے۔ (مترجم)}

"دائماً، ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیّت کی"

یہاں اس جملے میں ایک بار پھر امتیازیت موجود ہے۔ اضافی طور پر یہاں لفظ "انما" روایت ہوا ہے۔ عربی کے ان الفاظ کی ترکیب جو رسول ﷺ سے روایت ہوئی اس میں اعلان یا خبر مفعول سے پہلے ہے یہ ترتیب بھی امتیازیت کو ظاہر کرتی ہے۔

بعض اصحابِ علم جن میں قرطبی بھی شامل ہیں یہ بیان کرتے ہیں کہ مذکورہ جملہ محض اس سے پہلے کے جملے پر تاکید ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دوسرا جملہ پہلے جملے پر زور دینے کیلئے ہے تاکہ اخلاص (خالص اللہ کیلئے) کی اہمیت بیان کی جائے اور لوگوں کو ریا (دنیا کو دکھانے کیلئے) سے متنبہ کیا جائے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ نقطۂ نظر قابلِ فہم نہیں، کیونکہ جن دونوں جملوں کے متعلّق یہ کہا جارہا ہے وہ دونوں مختلف باتیں بیان کر رہے ہیں۔

لسانیات اور اسلامی نظریۂ قانون کے اُصول کے مطابق ایک جملہ دوسرے جملے کے معنی میں اضافہ کرتا ہے محض تاکید یا اصرار نہیں کرتا دراں حالیکہ اس کیلئے کوئی دلیل موجود ہو۔ حدیث کے مذکورہ دو جملوں کے متعلّق ابنِ عثیمین لکھتے ہیں،

اہلِ علم ان دونوں جملوں کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ ان

الدرینی، المناہج الاصولیہ فی الاجتہاد بل رائے (دمشق: دارالارشید، 1976)، جلد 1، ص ص۔ 365-376۔

دونوں کے معنی ایک ہیں اور دوسرا محض پہلے جملے پر تاکید ہے لیکن یہ درست نہیں کیونکہ کلام میں عمومی قاعدہ یہ ہے کہ نئی اطلاع یا معلومات پیش ہوں گی۔ محض تاکید نہیں۔ ان دونوں جملوں پر غور کرنے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کے مابین بہت بڑا فرق ہے۔

پہلا جملہ سبب بیان کرتا ہے اور دوسرا اس کا نتیجہ۔ پہلا جملہ جس میں سبب بیان ہوا ہے اس میں رسول ﷺ واضح کرتے ہیں کہ ہر عمل کا محرّک نیّت ہوتی ہے۔ ایک ذی عقل انسان کا آزادی سے کیا ہوا عمل نیّت کے بغیر ممکن نہیں۔ در حقیقت کچھ اصحابِ علم یہاں تک چلے گئے ہیں کہ "اگر اللہ تعالیٰ ہم پر کسی عمل کے کرنے کو یوں فرض کرتے ہیں کہ اس میں نیّت شامل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ ہم پر ایسی چیز فرض کر رہے ہونگے جو ہمارے اختیار میں نہیں۔" اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؛ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ ایک ذی عقل ہوتے ہوئے آزادی کے ساتھ بغیر کسی جبر کے کوئی عمل کریں اور اس میں نیّت شامل نہ ہو؟ یہ ناممکن ہے، کیونکہ عمل ہوتا ہے خواہش اور استطاعت سے۔ خواہش دراصل نیّت ہے۔ لہٰذا، جملۂ اولیٰ کے معنی ہیں کہ کوئی عمل کرنے والا عمل نہیں کرتا نیّت کے بغیر۔ یہ ضرور ہے کہ نیّتوں میں فرق ہوتا ہے اور زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ کسی کی نیّت بلند ترین ہو سکتی ہے جبکہ ایک دوسرے شخص کی نیّت پست ہو سکتی ہے۔ در حقیقت آپ دو اشخاص کو دیکھ سکتے ہیں جنہوں نے ایک ہی عمل کیا اور یہ دونوں برابر ہیں عمل کی ابتدا میں، درمیان میں، آخر میں، فعل میں، حرکت میں، بیان میں، اور پورے عمل میں لیکن ان کی نیّتوں میں اتنا فاصلہ ہے جیسے آسمان اور زمین میں۔ لہٰذا، بنیادی قصہ یہ ہے کہ بغیر نیّت کے کوئی عمل نہیں اور نتیجہ رسول ﷺ کے الفاظ میں موجود ہے "ہر ایک کیلئے وہی

کچھ ہے جس کی اس نے نیّت کی" اگر تمہارے اعمالِ شریعہ میں تمہاری نیّت اللہ (کی رضا) کیلئے ہے اور آخرت کیلئے ہے تو وہی تمھیں مل جائیں گے۔ اور اگر دنیا ہی کی نیّت ہے تو تم کو شاید یہ مل جائے یا نہ ملے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں،

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا۔

"جو کوئی (اس دنیا میں) جلدی حاصل ہونے والے فائدوں کا خواہشمند ہو، اسے یہیں ہم دے دیتے ہیں جو کچھ بھی جسے دینا چاہیں، پھر اس کے مقسوم میں جہنم لکھ دیتے ہیں جسے وہ تاپے گا ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہو کر۔" (بنی اسرائیل:18)

اُس نے یہ نہیں فرمایا کہ "ہم اسے جلد عطا کریں گے جس کی اس نے خواہش کی" بلکہ یہ فرمایا کہ "ہم جو چاہیں گے۔ یعنی جو اللہ پاک چاہیں گے۔ اور جس کو چاہیں گے۔ ہر انسان کیلئے نہیں" اس طرح اللہ پاک نے محدود کر دیا" جسے "عطا کیا جائے گا اور "جو" عطا کیا جائے گا۔ ایسے لوگ ہیں جنہیں دنیا عطا کی گئی اور ایسے بھی ہیں جو دنیا میں سے بہت کم ہی پاتے ہیں۔[1]

جملہ اولیٰ کی تفسیر کا ایک اور انداز یوں ہے کہ "تمام اعمال کا انحصار نیّتوں پر ہے" یعنی ایک عمل بغیر نیّت کے قابلِ ذکر ہی نہیں، یہ ہے جو جملہ اولیٰ میں بیان ہوا ہے۔ اس بنا پر انسان کے عمل کی جزا کا انحصار اس کی نیّت کی وسعت یا پیمائش تک محدود ہے۔ لہٰذا، دوسرا جملہ جو بعد میں آتا ہے وہ اس لیے ہے کہ اس کا انحصار جملہ اولیٰ کی اصلیت پر ہے۔ ابنِ رجب حدیث کے اس حصے پر روشنی ڈالتے ہوئے مندرجہ ذیل تذکرے میں لکھتے ہیں،

---

[1] محمد ابنِ عثیمین، شرح ریاض الصالحین (ریاض: دارالوطن، 1995) جلد1، ص ص۔13-12۔

یہ جملہ "ہر شخص کیلئے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیّت کی" ایک شرعی حکم کے بارے میں ہے، وہ یہ ہے کہ عمل کرنے والے کیلئے اس کے عمل میں سے صرف وہ حصہ ہے جو اس کی نیّت کا ہے۔ اگر یہ اچھی اور صالح ہے تو اس کا عمل بھی اچھا ہے اور اُس کو اس کی جزا ملے گی اور اگر یہ بُری ہے تو اُس کا عمل بھی بُرا ہے اور اس کا وبال اس پر ہے۔

ممکن ہے کہ "یقیناً سارے اعمال نیّتوں سے ہی ادا ہوتے ہیں" میں تقدیر یہ ہو کہ: نیک وبد، مقبول وغیر مقبول، قابلِ جزاو ناقابلِ جزا اعمال کا انحصار نیّتوں پر ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ یہ ایک اُصولِ شرعی ہے یعنی کسی عمل کا اچھا یا نامناسب ہونا اس کی نیّت کی اچھائی یا اس کے نامناسب ہونے پر موقوف ہے۔

رسول ﷺ کا اس کے بعد یہ بیان کرنا کہ "ہر شخص کیلئے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیّت کی" یہ خبر دیتا ہے کہ اس کے عمل میں سے اس کیلئے وہی ہے جس کی اس نے نیّت کی۔ اگر نیّت اچھی تھی تو اس کا بدلہ بھی اچھا ہی ملے گا اور اگر بُری تھی تو اس کا بدلہ بھی بُرا ہی ملے گا۔ یہ محض پہلے جملے کی تکرار نہیں ہے۔ پہلا جملہ یہ ظاہر کررہا ہے کہ کسی عمل کی اچھائی یا بُرائی اس نیّت سے ہے جس کی وجہ سے یہ عمل ہوا۔ جبکہ دوسرا جملہ یہ بتاتا ہے کہ عمل کی جزا عمل کرنے والے کیلئے اس کی نیک نیّتی پر منحصر ہے اور عمل کرنے والے کی سزا اس کی بدنیّتی پر منحصر ہے۔ اس کی نیت مُباح ہو تو اسی طرح عمل بھی مُباح ہو سکتا ہے اور ایسی صورت میں عمل کرنے والے کیلئے نہ جزا ہے نہ سزا۔ عمل بذاتِ خود، اس کی اچھائی، اس کا مناسب ہونا، یا اس کا مُباح ہونا اس نیّت پر منحصر ہے جو اس عمل کے ظہور پذیر ہونے میں کارفرما ہوئی۔ جزا، سزا یا ان دونوں کا نہ ہونا عمل کرنے والے کی نیّت کا مرہونِ منت ہو گا،

جس کی بنا پر یہ عمل لائقِ جزا، سزا یا مُباح قرار پائے گا۔[1]

یہاں اب بھی ایک مسئلہ ہے۔ ہر ایک کو وہ کچھ نہیں ملتا جس کی اس نے نیّت کی ہو۔ مثلاً کسی شخص نے ہجرت کی اس نیّت سے کہ فلاح خاتون سے نکاح کرے گا مگر خاتون نے نکاح کرنے سے انکار کر دیا، اس صورت میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسے وہ مل گیا جس کی اس نے نیّت کی۔ مزید براں کفّار کی نیّت یہ نہیں ہوتی کہ ان کو سزا ملے لیکن اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ آخر کار ایسا ہو گا۔

اگر مذکورہ حدیث کو اس کی مکمل صورت میں دیکھا جائے تو حدیث کا بقیہ حصہ اس نکتے پر کچھ روشنی ڈالتا ہے، اس حصے پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نیّت کی چند عمومی اقسام ہیں۔ خالص اور نیک نیّت کسی کام کو اللہ تعالیٰ کی خاطر کرنے کی ہوتی ہے۔ ایک اور قسم وہ ہے جس کا تعلّق اس دنیا کی مُباح چیزوں کو حاصل کرنے سے ہوتا ہے۔ چند اصحابِ علم نے ایسی نیّت کو مُباح ہی کہا ہے جو دنیا کیلئے یا نکاح کی غرض سے ہو۔ نیّت کی وہ قسم جو قابلِ ملامت ہے شاید ایسی نیّت کا یہ حدیث احاطہ نہیں کرتی یا ممکن ہے کہ ایسی نیّت کی تحقیر کی بنا پر صرف اس کی طرف اشارہ ہے اور رسول ﷺ نے اس کا ذکر نہیں کیا (مثلاً تصوّر کیجئے کہ ایک شخص کسی خاتون سے بدکاری کی نیّت سے ہجرت کرتا ہے)۔ ممکن ہے کہ محض کسی عورت سے نکاح کرنے کی خاطر ہجرت کرنا بھی قابلِ ملامت ہی ہو اس لیے کہ دکھاوا تو ایک نیک کام کرنے کا (یعنی دین کیلئے ہجرت) ہو لیکن اس کے لیے کی گئی نیّت بالکل مختلف ہو۔

ہر ایک عمل کے صلے میں انسان کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیّت کی۔ اگر نیّت اللہ تعالیٰ کے لیے تھی اور وہی نیک نیّت ہے اور اس کے مطابق ہی اسے اللہ تعالیٰ کی رضا اور جزا

---

[1] ابنِ رجب، جامی، جلد1، ص ص۔65-64۔

ملے گی۔ اگر دینی اعتبار سے نیّت نہ نیک ہو نہ بد تو اس کا بدلہ بھی دینی اعتبار سے کچھ نہیں، دنیاوی اعتبار سے ممکن ہے کہ نتیجہ بالکل ویسا نہ ہو جس کی اس نے نیّت کی لیکن اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتے اور کوشش کرنے والے کو ضرور دیتے ہیں۔ اس پر دوبارہ نظر کیجئے کہ حدیث کو مجموعی طور پر دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس نقطۂ نظر کو تقویت دے کہ اسے وہی ملے گا جس کی اس نے کوشش کی۔ اصل مفہوم یہ ہوگا کہ اگر نیّت بُری تھی تو آخر کار اس کیلئے نتیجہ بھی بُرا ہی ہوگا۔

ذیل میں دی گئی قرآنی آیات سے حدیث کی مذکورہ بالا تشریح میں مدد ملتی ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَ هُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔

”جو لوگ بس اس دنیا کی زندگی اور اس کی خوشنمائیوں کے طالب ہوتے ہیں ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ (وہاں معلوم ہو جائے گا کہ) جو کچھ انہوں نے دنیا میں بنایا وہ سب ملیا میٹ ہو گیا اور اب ان کا سارا کیا دھرا محض باطل ہے۔“ (ہود:16-15)

{نوٹ: ان آیات کے سیاق سے خبر ملتی ہے کہ یہاں حوالہ کفّارِ مکّہ کی جانب ہے۔ محترم امین احسن اصلاحی اپنی تدبّرِ قرآن میں ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں، ”اوپر (اس سورۃ کی) آیت نمبر 12 میں کفّار کے اس طعنے کا حوالہ گزر چکا ہے کہ وہ نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کی بے سروسامانی کو آپ ﷺ کی رسالت کے خلاف بطور دلیل پیش کرتے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ جب ہم دنیاوی اسباب و وسائل کے اعتبار سے ان سے نہایت بہتر حالت میں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی نگاہوں میں بھی ہم ان سے بہترین

ہیں۔ پھر ہم کو خدا کے غضب سے ڈرانے کے کیا معنی؟۔۔ ان دونوں آیات میں ان کے اس مغالطے کا جواب دیا گیا ہے فرمایا کہ یہ دنیا اور اس کی نعمتیں نیک اعمال کے صلے کے طور پر نہیں ملتیں کہ جو نیک اعمال نہ کریں وہ ان سے محروم رہیں۔ یہ دنیا تو نیک وبد دونوں کو ملتی ہے۔ البتہ جو دنیا ہی کے طالب ہوتے ہیں اور آخرت کی ان کو کوئی پروا نہیں ہوتی ان کا سارا کھاتا یہیں بے باق کر دیا جاتا ہے آخرت میں ان کے لیے دوزخ کے سوا کچھ نہیں بچتا۔"

ہمارے لیے حکم یہ نہیں کہ انسان اس دنیا میں بھلائی پانے کی نہ تو خواہش کرے نہ دعا بلکہ اس کے بر عکس رسول ﷺ نے اہلِ ایمان کو اس قرآنی دعا کی تعلیم دی ہے،

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

"اے ہمارے ربّ! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی، اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔"(البقرہ:201)

اولاً، دنیا کے طلب کرنے اور حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں جبکہ صرف دنیا کا حُصول ہی پیشِ نظر نہ ہو بلکہ دنیا کے حُصول میں بھی مطمحِ نظر آخرت ہی ہونا چاہیے۔ مثلاً، کوئی شخص ایک بڑے گھر کی خواہش یا دعا اسلیے کرے کہ اس میں بڑی جگہ ہو گی جہاں میں لوگوں کے لیے درسِ قرآن کا اہتمام کر سکوں گا وغیرہ۔ اس قسم کی صورت میں دنیا میں کچھ حاصل کرنا اس کی آخرت کے لیے بھی فائدہ مند ہو گا۔

ثانیاً، یہ کہ نیک اعمال کا بدلہ دینے میں اللہ بڑا فراخدل ہے خصوصاً اہلِ ایمان کے لیے وہ بہانے بہانے سے ایک نیک عمل کی جزا کو کئی گنا اضافے کے ساتھ اپنے پاس لکھ لیتا ہے جبکہ گناہوں کا معاملہ اسکے بر عکس ہے۔۔ ہم امید کر سکتے ہیں کہ اگر اعمال کی کچھ جزا اس دنیا میں ہی مل گئی تو معاملہ یہ نہیں کہ آخرت میں خالی ہاتھ ہی جانا ہو گا اور عذابِ جہنم کا سامنا کرنا ہی ہو گا،اللّٰہم اعوذ بکا من النار۔

ایک اور پہلو جو یہاں وضاحت طلب ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ

فرماتے ہیں کہ ہم اس دنیامیں بدلہ پانے کی خواہش رکھنے والے کو پورا بدلہ دیں گے جبکہ پچھلے صفحوں میں سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر 18 کا حوالہ دیا گیا جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جو جلدی ملنے والے بدلے (یعنی دنیا) کا خواہشمند ہو تو ہم دے دیتے ہیں جسے چاہیں جتنا چاہیں۔

یعنی مراد یہ ہے کہ جو صرف اس دنیا کی رنگینیوں میں کھو گیا (وہ جو کفّار میں سے ہو جو سورۃ ہود 16-15 میں مخاطب ہیں) اور اپنے اعمال کا بدلہ اس دنیا میں ہی طلب کرنے لگا تو اللہ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کا پورا بدلہ ہم اسکو اسی دنیا میں بغیر کمی کے عطا کریں گے البتہ آخرت میں وہ سوائے جہنم کے اور کسی چیز کی خواہش نہ کرے اور بفرضِ محال آخرت میں بھی اگر نیک تمنا یا نیک خواہش کرے گا تو ہم اسکو بتائیں گے کہ تم اپنے اعمال کا بدلہ دنیا میں لے چکے۔ ہاں بدل چاہیے تو مُبدِّل لے آؤ یعنی اعمالِ صالحہ لے آؤ اور جنّت کی نعمتیں پالو ورنہ آگ میں جلو۔ اہلِ ایمان کے لیے البتہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کی بہت سی جزا آخرت کے لیے اٹھار کھتے ہیں۔ (مترجم)}

خلاصہ، "یقیناً تمام اعمال کا دارومدار نیّتوں پر ہے اور دائماً، ہر شخص کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیّت کی"

کسی ذی عقل کا ایسا عمل جو وہ جانتے بوجھتے ہوئے ارادتاً کرتا ہے اس کا محرّک نیّت ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں عمل وقوع پذیر ہوتا ہے۔ نیّت کے بغیر عمل سرزد نہیں ہوتا۔ اب نیّت تین میں سے ایک طرح کی ہوسکتی ہے۔ نیک، بد یا دینی اعتبار سے ان دونوں صِفات سے مبرّا۔ (بُری یا بدنیّت کسی ایسے کام کو کرنے کی ہوتی ہے جو گناہ کا کام ہو ایسے دعوے کے باوجود کہ اس کا مقصد اچھا تھا)۔

تمام صورتوں میں ہر شخص کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیّت کی۔ اگر اس کی نیّت

اچھی اور نیک تھی تو اس کا مطلب ہے کہ یہ نیّت اللہ تعالیٰ کیلئے تھی۔ کیونکہ اس کی نیّت اچھی تھی تو اس کا نتیجہ حتمی طور پر اچھا ہی ہو گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۔

”نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔“ (الرّحمٰن:60){یعنی نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا کچھ نہیں}

یہ اس کو آخرت میں اچھائی ہی کی صورت میں ملے گا الّا یہ کہ وہ خود ہی کوئی ایسا عمل کرے کہ جو اس کی جزا کو زائل کر دے۔ اور یہ اس کیلئے اس دنیا میں بھی فائدہ مند ہو گی۔ بہر حال زیادہ اہم پہلو آخرت کی جزا کا ہی ہے۔

اگر کوئی شخص ایک مُباح عمل کی نیّت کرتا ہے جو دینی لحاظ سے نہ نیک نیّت ہے اور نہ بد تو یہ ایک ایسی نیّت ہے جس کی اجازت تو ہے لیکن آخرت میں اس کیلئے نہ جزا ہے نہ سزا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دنیاوی اعتبار سے بھی اسے وہ کچھ نہ ملے جس کی اس نے نیّت کی جیسا کہ نکاح کی غرض سے ہجرت کی اور بالآخر اس عورت نے جس کیلئے ہجرت کی، نکاح سے انکار کر دیا۔ لیکن، اللہ تعالیٰ کسی سے زیادتی نہیں کرتا اور کوشش کرنے والوں کو صلہ ملتا ہے چاہے یہ کوشش دنیا کیلئے ہی کیوں نہ ہو۔ جو لوگ صرف دنیا کیلئے کوشش کرتے ہیں اللہ ان کو اس میں سے دیتا ہے، لیکن آخرت میں ان کیلئے کچھ نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَ هُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔

”جو لوگ بس اس دنیا کی زندگی اور اس کی خوشنمائیوں کے طالب ہوتے ہیں ان کی کار گزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ (وہاں معلوم ہو

جائے گا کہ)جو کچھ انہوں نے دنیا میں بنایا وہ سب ملیا میٹ ہو گیا اور اب ان کا سارا کیا دھرا محض باطل ہے۔" (ہود:16-15)

{گزشتہ صفحات میں اس آیت کی تفسیر سے متعلّق مترجم کا نوٹ ملاحظہ فرمائیں۔}

اگر نیّت بُری ہے یہ مانتے ہوئے کہ اس حدیث میں اس کا بھی احاطہ ہوا ہے جو کہ بہت ممکن ہے کیونکہ لفظِ اعمال عمومی ہے۔ نتیجہ وہی ہو گا جیسی نیّت تھی یعنی اس کیلیئے ایک بُرا انجام۔ یا تو اس کی سزا اس دنیا ہی میں مل جائے گی یا آخرت میں (اس استثنا کے ساتھ کہ اگر وہ آگے چل کر توبہ کر لے)۔ اللہ تعالیٰ کسی نفس سے زیادتی نہیں کرتا یہ اس کی بُری نیّت ہی ہوتی ہے جو بُرے انجام کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ یہ بُرا انجام اُس کیلیئے ہو گا۔ اس نے جیسی نیّت کی تھی اسے ویسا ہی بدلہ ملے گا۔ حالانکہ اس نے اپنے لیے بُرا انجام نہیں چاہا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔

"اور تمہیں جو بدلہ بھی دیا جارہا ہے انہی اعمال کا دیا جارہا ہے جو تم کرتے رہے ہو۔" (الصّٰفّٰت:39)

حدیث کے زیرِ نظر حصے سے متعلّق چند مزید نکات

نیّتیں اعمال سے آگے چلتی ہیں

دل کی کیفیت یعنی نیّت کسی شخص کو ان اعمال سے آگے لے جاتی ہے جو وہ طبعی طور پر اپنے اعضا اور جوارح کو استعمال میں لا کر کرتا ہے۔(دھیان میں رہے کہ نیّت کو ایسے کاموں کیلیئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے جن کے کرنے کی استطاعت موجود نہ ہو)۔ زمانۂ رسالت میں ایک شخص نے جہاد پر جانے کی تیاری کی، لیکن اس سے پہلے کہ وہ جہاد پر روانہ ہوتے ان کی

موت واقع ہو گئی۔ ان کی بیٹی نے کہا "کیا ہی اچھا ہوتا اے میرے والد کہ آپ شہادت پاتے کیونکہ آپ نے اس مقصد کے لیے تیاری کی تھی۔" رسول ﷺ نے فرمایا،

فان اللّٰہ عزوجل قداوقع اجرہ علیہ علی قدر نیّتہ۔

"اللّٰہ عزوجل نے اُس کو اُس کی نیّت کے مطابق جزا عطا کی۔"[1] صحیح البخاری اور صحیح مسلم میں موجود ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول ﷺ نے ایک مہم پر سفر کے دوران ارشاد فرمایا،

ان اقواما بالمدینۃ خلفنا ماسلکنا شعبا ولا وادیا الا وھم معنا فیہ جسھم العذر۔

"مدینے میں رہ جانے والوں میں سے ایسے لوگ ہیں کہ ہم کسی گھاٹی یا وادی سے نہیں گزرے کہ وہ ہمارے ہمراہ نہ رہے ہوں (جزا میں) وہ پیچھے رہے کسی جائز عذر کی وجہ سے۔"

یہ نظریہ کہ ایک شخص اپنی نیّت کی وجہ سے اپنے عمل سے بھی آگے نکل جاتا ہے، شاید حدیث کے اس حصے سے علاقہ رکھتا ہو "ہر شخص کیلئے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیّت کی"، اگرچہ کہ اصحابِ علم نے اس نکتے پر مذکورہ حدیث کے ضمن میں بحث کی ہے لیکن اس کے باوجود یہ کہنا محال ہے کہ حدیث کا اشارہ اس طرف ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ حدیث صرف ان اعمال اور نیّتوں کے حوالے سے ہے جو اعمال درحقیقت وقوع پذیر ہوتے ہیں ، بہرصورت اس پہلو سے نیّت کی اہمیت پر ضرور روشنی پڑتی ہے اور واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے کس طرح دیکھتے ہیں۔

---

[1] مالک، النسائی اور دیگر اشخاص نے اسے محفوظ کیا۔ الاشقر نے اپنے ایک زیریں حاشیے میں لکھا ہے کہ اس کا سلسلۂ روایت صحیح ہے۔ الاشقر، مقاصد، ص۔58۔

کس قسم کے اعمال شامل ہیں

یہ قول کہ ''یقیناً تمام اعمال کا دارومدار نیّتوں پر ہے'' تمام اعمال کو محیط کیے ہوئے ہے۔ اس میں قولی اور فعلی اعمال، فرض، مستحب اور جائز اعمال شامل ہیں۔ امام احمد ابنِ حنبل فرماتے ہیں ''میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ ہر عمل کی ابتدا نیّت سے ہو چاہے وہ نماز ہو، روزہ ہو، صدقہ ہو، یا کسی اور قسم کا عمل'' زید الشامی فرماتے ہیں ''میں پسند کرتا ہوں کہ ہر عمل کیلئے نیّت کی جائے چاہے وہ کھانا پینا ہی کیوں نہ ہو۔''

اس امر میں اختلاف ہے کہ مخصوص اعمال کا نہ کرنا بھی اس زُمرے میں آتا ہے یا نہیں جن کا یہ حدیث احاطہ کرتی ہے۔ کیا ''عمل نہ کرنا'' یا ''بچنا'' بھی عمل کی طرح ہی سمجھا جائے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب سے قوی نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی خاطر کسی عمل کے کرنے سے اپنے آپ کو بچائے تو وہ اس کی جزا پائے گا۔ یعنی جانتے بوجھتے اور آزادیٔ عمل کے باوجود وہ بُرا عمل نہیں کرتا تو ایسا شخص جزا کا مستحق ہے۔ یہ مثال کے طور پر ایسی صورت ہے کہ کوئی قصداً اپنے برابر میں کھڑی ہوئی خاتون کو نہیں دیکھتا۔ اگر کوئی شخص کچھ مخصوص اعمال سے پرہیز کرتا ہے لیکن ایسا وہ اللہ تعالیٰ کی خاطر نہیں کرتا تو ایسے عمل پر کوئی جزا نہیں۔ مثلاً، ایک مسلمان صرف اپنے برابر میں کھڑی ہوئی خاتون پر اس لیے نظر نہیں ڈالتا کیونکہ وہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہے اور خاتون کی طرف دھیان نہیں گیا تو ایسا اس نے جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کی خاطر نہیں کیا یا یوں کہیے کہ اس کی نیّت خاتون کی طرف نہ دیکھنے کی نہیں تھی۔

اللہ تعالیٰ صرف ان اعمال کو قبول کرتا ہے جو خالصتاً اس کیلئے ہوں اور اس کی شریعت کے مطابق ہوں

اس بات کو بھی ذہن میں رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے اعمال کو قبول نہیں کریں گے جو خالصتاً اللہ تعالیٰ کیلئے نہ کیے گئے ہوں۔ اخلاصِ نیّت کے ساتھ اللہ کیلئے کیے گئے اعمال، جو اللہ کے احکام کے مطابق ہوں قطع نظر اس کے کہ یہ اعمال زندگی کے کسی بھی پہلو سے تعلّق رکھتے ہوں۔ چاہے یہ عمل عبادت کا ہو، کاروباری لین دین کا ہو، یا دوستوں اور پڑوسیوں کے ساتھ برتاؤ کا یا اور کوئی عمل۔ ابنِ عجلان کہتے ہیں کہ "کوئی عمل کار آمد نہیں جب تک اس کے ساتھ تین چیزیں نہ ہوں، اللہ تعالیٰ کی پہچان (تقویٰ) ، اچھی نیّت اور اس عمل کا درست ہونا۔"[1]

ایک اور نکتہ جس کی اہمیت کو واضح کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اگر اچھی نیّت موجود ہے تو اس کا لازمی نتیجہ اچھے عمل کی صورت میں سامنے آنا چاہیے۔ کچھ لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی نیّت اچھی تھی لیکن اس کے باوجود ان کا عمل قرآن وسنّت کے مطابق نہیں ہوتا۔ یہ اس بات کی نفی ہے کہ ان کی نیّت اچھی تھی۔ نیّت ہی دراصل وہ علّت ہے جس کی بنا پر عمل سامنے آتا ہے۔ یعنی اگر نیّت موجود ہے تو عمل ضرور سامنے آتا ہے۔

ایسا بھی ہے کہ بظاہر عمل اچھا ہے لیکن دل میں کوئی اچھائی نہیں۔ یہ منافقین کی صورتحال ہے جو اپنے تئیں پوری کوشش کریں گے کہ ظاہری طور پر عمل اچھا نظر آئے۔[2] بہر حال اس کے بر خلاف والی صورت ممکن نہیں کیونکہ اعمال نیّت کے نتیجے میں ہی ہوتے ہیں۔ اگر اچھی نیّت دل میں موجود ہے اور کوئی رکاوٹ بھی نہیں جو عمل سے روکے تو ایسی

---

[1] حوالہ در ابنِ رجب، جامی، جلد 1، ص۔ 71۔

[2] ایک منافق اپنی منافقت کو بہت سے لوگوں سے چھپا سکتا ہے لیکن اس کے اطوار میں ایسی نشانیاں ہونگی جو اس کی منافقت کو ظاہر کرینگی۔

صورت میں عمل سامنے آئے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا مخلص ارادہ اور خواہش موجود ہے تو ایسا شخص اللہ کی فرمانبرداری کرے گا ایسا معاملہ عمومی طور پر ممکن نہیں کہ کسی شخص میں اللہ کی فرمانبرداری کی صلاحیت ہے اور پھر بھی وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا مرتکب ہو رہا ہو اور ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی ہو کہ نیّت اچھی ہے۔ مذکورہ حدیث میں رسول ﷺ نے ایسی صورت حال کی یکسر تردید کی ہے۔

"نیّت اور نیّت"

کوئی عمل جو صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے کیا جائے اور وہ عمل شریعت کے مطابق بھی ہو تو ایسا عمل اللہ کی عبادت ہو گا۔ ایسا معاملہ بھی ہے کہ کچھ اعمال ایسے ہیں کہ جن کا اللہ کے حضور مقبول ہونا نیّت کے ساتھ مشروط ہے۔ جمہور کی رائے کے مطابق ایسے اعمال میں وضو، غسل، تیمّم، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور اعتکاف جیسے اعمالِ عبادت شامل ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی شخص کھانے کے لیے کچھ میسّر نہ ہونے یا بیماری کے باعث سارا دن بھوکا رہے، تو ایسا کرنا روزہ رکھنے کے برابر نہیں جو کہ ایک عبادت ہے، لہٰذا، جو شخص عبادت کی غرض سے روزہ رکھنے کی خواہش رکھتا ہو اسے عبادت کی غرض سے روزہ رکھنے کی نیّت کرنا ہو گی۔ اس بنا پر اعمالِ عبادت کو روزمرہ کے اعمال سے ممتاز کرنے کیلئے عمل کرنے والے شخص کے دل میں نیّت کا موجود ہونا ضروری ہے۔

{مترجم نے یہاں پر صحیح مسلم کی اس حدیث کا حوالہ دینا مناسب سمجھا جس میں آتا ہے، عائشہؓ نے کہا، " رسول ﷺ میرے ہاں آئے اور فرمایا، 'کیا تمہارے پاس [کھانے کے لیے] کچھ موجود ہے۔ اس پر ہم نے کہا 'نہیں' انہوں نے فرمایا، 'تو پھر میں روزے سے ہوں' "(مسلم)۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ نفل روزے کے لیے روزہ شروع کرنے سے پہلے نیّت کرنا لازمی نہیں تاہم، فرض روزے کے لیے یہ لازمی ہے۔}

یہ بھی ہے کہ، نماز اور دیگر اعمالِ عبادت فرض بھی ہو سکتے ہیں اور نفل بھی۔ اگر کوئی شخص ایک فرض عمل کی ادائیگی کیلئے کھڑا ہوتا ہے تو اسے عمل کی ابتداء سے قبل یہ نیّت کرنا ہو گی کہ وہ فرض عمل ادا کر رہا ہے، نہ کہ ایک نفل یا اضافی عمل۔ {غور کیجئے تو فجر کی دو سنّتوں اور دو فرض رکعت میں نیّت کے علاوہ کوئی فرق نہیں۔ (مترجم)}

یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص غسل کرتا ہے تو یہ غسل اپنے آپ کو صاف ستھرا رکھنے کی غرض سے بھی ہو سکتا ہے اور اللہ کی عبادت کیلئے اپنے آپ کو پاک کرنے کی غرض سے بھی۔ آخر الذّکر صورت میں یہ عمل بذاتِ خود ایک عملِ عبادت بن جائے گا (احناف کے علاوہ تمام کی رائے میں[1])۔ اس لیے ایسے عمل سے قبل پاکیزگی حاصل کرنے کی نیّت کر لینی چاہیے۔

{آج وہ نوجوان جو ایسے کھیلوں میں وقت لگاتے ہیں جن میں ذہنی اور جسمانی ورزش ہوتی ہے ان کو اس بات پر غور کرتے ہوئے اپنی نیّت کو اللہ کیلئے کر کے یہ سوچنا چاہیے کہ اس ذہنی اور جسمانی ورزش کے ذریعے وہ اپنی جسمانی اور ذہنی قوّت کو اللہ کی راہ میں کام کرنے کے لیے تیار کر رہے ہیں ایسا کرنے سے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں یہ توفیق بھی دے گا کہ وہ اس کی راہ میں اپنی صلاحیتوں کو استعمال کریں، کیونکہ اعمال نیّتوں ہی سے ہوتے ہیں۔ (مترجم)}

ایسے اعمال بھی ہیں جن کے درست ہونے کیلئے نیّت شرط نہیں، مثلاً اپنے لباس کو نماز کیلئے گندگی سے صاف رکھنا ضروری ہے۔ تو اگر کوئی شخص اپنی قمیص کو کپڑے دھونے کی مشین میں ڈالے جس سے قمیص کی گندگی دُھل جائے تو اس قمیص کو پہن کر نماز ادا کی جا سکے

[1] دیکھیں الاشقر، مقاصد، ص ص۔320-301۔

گی، اس کے باوجود کہ اس شخص کی نیّت قمیص کو پاک کرنے کی نہ بھی ہو، یعنی اس قسم کے اعمال کیلئے نیّت شرط نہیں۔[1]

ایک جیسے اعمال اور نیّت کا فرق

اس حدیث میں آگے چل کر رسول ﷺ فرماتے ہیں "تو وہ جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کیلئے تھی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کیلئے تھی اور وہ جس کی ہجرت دنیاوی فائدے کیلئے یا کسی خاتون سے نکاح کے لیے تھی تو اس کی ہجرت اسی کے لیے تھی جس کیلئے اس نے ہجرت کی" ان چند الفاظ میں رسول ﷺ نے سمجھا دیا کہ ایک ہی عمل کسی کیلئے تو جزا کا باعث بنتا ہے اور یہ بھی امکان ہے کہ وہی عمل کسی اور کیلئے سزا کا باعث بن جائے {یا بے فائدہ رہے}۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ہی طرح کا عمل اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف درجے کی جزا یا سزا کا باعث بن سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص کوئی خاص عمل اللہ تعالیٰ اور اس کی خوشنودی کیلئے اور اس کی سزا سے ڈرتے ہوئے کرتا ہے تو وہ اپنے اخلاصِ نیّت کی وجہ سے سات سو گنا (یا اس سے بھی زیادہ) اس عمل کی جزا پائے گا، زیادہ ڈر، امید اور اللہ تعالیٰ کی محبّت اس عمل کو اور زیادہ اجر سے بار آور کرائیں گے، ان لوگوں کی بنسبت جو ایسا ہی عمل کریں لیکن ان صِفات سے محروم ہوں۔ علی ابن المدینی نے ایک بار فرمایا "ایک چھوٹا عمل اس کی پشت پر موجود نیّت کی بنا پر بڑا عمل بن جاتا ہے اور اسی طرح ایک بڑا عمل اس کی پشت

---

[1] ابنِ تیمیہ (مجموعہ، جلد 18، ص۔258) پر ہے کہ شافعیہ اور احناف کے کچھ بعد کے علما یہ رائے رکھتے تھے کہ ایک شخص کیلئے ضروری ہے کہ لباس کی گندگی صاف کرنے کی نیّت کرے۔ ابنِ تیمیہ کے مطابق یہ ایک عجیب وغریب رائے ہے۔

پر موجود نیّت کی وجہ سے چھوٹا عمل بن جاتا ہے۔"[1]

مزید یہ کہ ایک شخص مسجد میں نماز ادا کرتا ہے اور بہت سے کاموں کی نیّت کیے ہوئے ہے جو سب درست ہیں۔ ان سب کاموں میں مطمحِ نظر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔ وہ مسجد میں حاضر ہوتا ہے نماز باجماعت کی نیّت سے، اپنی نماز کے معیار کو بڑھانے کیلئے، دوسروں کے لیے مثال بننے کے لیے، مسجد کو آباد کرنے اور دوسروں سے مل کر دینی بھائی چارگی کے رشتے کو مضبوط کرنے کی خواہش کے ساتھ۔ تو اس کے مسجد جانے کا عمل ان تمام کاموں کی نیّت کے سبب اللہ تعالیٰ کی بڑی خوشنودی کا باعث بنے گا۔[2]

اگر کوئی شخص صرف اس وجہ سے نماز میں شامل ہوتا ہے کہ ایک فرض ادا کرنا ہے لیکن اس فرض کو وہ سستی کے ساتھ اور اللہ کی خوشنودی کو کم ہی پیشِ نظر رکھتے ہوئے ادا کرتا ہے تو اسے اجر بھی اُسی حِساب سے ہی ملے گا۔ مثلاً، اگر کوئی صرف اپنے والد کی سزا سے ڈر کر نماز پڑھتا ہے تو شاید وہ اللہ سے اس کی سزا پائے گا۔ یہ اس لیے کہ اس نے یہ عمل فرض ادا کرنے کی نیّت سے نہیں کیا۔ مزید یہ کہ اگر کوئی شخص محض اس لیے نماز پڑھے کہ لوگوں کو دھوکا دے تاکہ وہ اسے ایک نیک انسان سمجھیں تو وہ شدید عذاب کا مستحق ہوگا، اس دکھاوے یا ریاکاری کی وجہ سے۔ اور ایسے عمل کو رسول ﷺ نے شرک قرار دیا ہے۔

اس قسم کی ایک مثال دنیاوی تعلیم کے حُصول کے سلسلے میں بھی دیکھئے۔ اگر کوئی شخص اپنی تعلیم دینِ اسلام کی خاطر حاصل کرے تاکہ مسلمانوں کے لیے سودمند ہو یا اس لیے کہ

---

[1] حوالہ در ابنِ رجب، جامی، جلد1، ص۔71۔

[2] سورۃ طٰہٰ کی آیت نمبر 18 میں موسیٰ علیہ السلام اپنے عصا کے کئی استعمال بتاتے ہیں۔ ابنِ حبیرہ اس حوالے سے یہ بیان کرتے ہیں کہ ایک عمل یا مطمحِ نظر کے کئی اچھے مقاصد ہو سکتے ہیں اور اس شخص کو ان تمام اچھی چیزوں کا اجر ملے گا، جس کی اس نے نیّت کی، دیکھیں الوزیز، ابنِ حبیرہ، الافصاح عن معانی، الصحاح (ریاض: دار المومن، 1996)، جلد1، ص۔136۔

غیر مسلموں سے زیادہ آگے نکل جائے، تو ایسے عمل کی جزا بھی اس کے مطابق ہو گی۔ اس کے مقابلے میں اگر تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ایک صاحبِ علم کی حیثیت سے جانا جائے یا صرف اس دنیا ہی کے کمانے میں آگے بڑھنے کی جستجو ہو، تو اس صورت میں سزا یا جزا اسی کے مطابق ہو گی۔ ایسی ہی مثال کسی بھی عمل کے سلسلے میں دی جا سکتی ہے۔

جو اعمال اللہ کی خاطر نہیں ہوتے وہ کئی اور وجوہات سے ہو سکتے ہیں۔ بعض اوقات محض دکھانے کے لیے ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ منافقین کے بارے میں فرماتے ہیں،

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَ اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا۔

"یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ جب نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے {سستی کیساتھ} محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اُٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔" (سورۃ النساء:142)

اللہ تعالیٰ مزید فرماتے ہیں:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ۔ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ۔ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ۔ وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ۔

"پھر تباہی ہے اُن نماز پڑھنے والوں کے لیے۔ جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں (بے خبر ہیں)۔ جو ریاکاری کرتے ہیں۔ اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں۔ {اور ادنیٰ چیزوں میں بھی بخل برتتے ہیں}۔" (الماعون:7-4)

اور اللہ تعالیٰ ایسے کافروں کے بارے میں جو صرف دکھاوے کیلئے اعمال کرتے ہیں فرماتے ہیں،

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ

اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ۔

”اور اُن لوگوں کے سے رنگ ڈھنگ نہ اختیار کرو جو اپنے گھروں سے اِتراتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کی روش یہ ہے کہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔جو کچھ وہ کررہے ہیں وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔“(انفال:47)

یہ ان کافروں کا ذکر ہے جو جنگ کیلئے صرف دکھاوے کی غرض سے نکلے تاکہ یہ دکھائیں کہ وہ کتنے بہادر اور ہمت والے ہیں۔یعنی وہ صرف لوگوں کو دکھانے کیلئے نکلے۔

کبھی ایک عمل اللہ کیلئے بھی ہوتا ہے اور اس میں دکھاوے کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے؛ ایسے معاملے میں اگر عمل کی تحریک پیدا کرنے والا عنصر دکھاوا ہے تو ایسا عمل بیکار ہے۔ صحیح مسلم میں ایک حدیثِ رسول ﷺ ابوہریرہؓ کی سند سے آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

انا اغنی الشرکاءعن الشرک من عمل عملا اشرک فیہ معی غیری ترکتہ وشرکہ۔

”میں اتنا بے نیاز ہوں کہ مجھے کسی شریک کی ضرورت نہیں اس لیے اگر کوئی کسی اور کیلئے کوئی عمل کرتا ہے اور ساتھ ہی میرے لیے بھی تو میں ایسے عمل کو پھیر دوں گا اس کی طرف جسے اس نے میرے ساتھ شریک کیا۔“

رسول ﷺ کی ایک اور حدیث مبارکہ میں آتا ہے،

عن ابی موسی رضی اللّٰہ عنہ قال جاءرجل الی النبی ﷺ فقال الرجل یقاتل للمغنم والرجل یقاتل للذکر والرجل یقاتل لیری مکانہ فمن فی سبیل اللّٰہ قال من قاتل لتکون کلمة اللّٰہ ہی العلیا فھوفی سبیل اللّٰہ۔

”ابوموسیٰؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول ﷺ کے پاس آیا اور بولا“ ایک شخص مالِ غنیمت کیلئے لڑتا ہے اور ایک اس لیے لڑتا ہے کہ اس کا نام ہوجائے[لڑنے والوں میں]اور ایک دکھاوے کیلے لڑتا ہے۔کون ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑتا ہے”(ان لڑنے

والوں میں)۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کیلیئے لڑتا ہے تو وہی ہے جو اللہ کی راہ میں لڑتا ہے۔"(البخاری و مسلم)

اکابرینِ سلف جن میں عبادہ ابنِ صامتؓ، ابو درداءؓ ، سعید ابنِ مسیّبؒ کے علاوہ کئی اور بھی شامل ہیں، فرماتے ہیں، ایسا عمل جو اللہ کیلیئے بھی ہو اور کسی اور کیلیئے بھی ہو تو ایسا عمل بے ثمر ہو گا۔ ابنِ رجب نے کہا" مجھے ایسے کسی اختلاف کا علم نہیں جو ہمارے برگزیدہ اجداد میں اس امر پر رہا ہو۔ہاں متاخرین کے چند اصحابِ علم نے اس امر میں مختلف رائے رکھی ہے"[1]

اگر کوئی شخص جہاد کی نیّت کرے اور اس کے ساتھ اور کوئی نیّت بھی ملالے تو اگر دکھاوے کی نیّت نہ ہو تو دیگر صورتوں میں علمائے متاخرین کی رائے میں اس کا اجر کم ہو جائے گا لیکن مکمل طور پر ضائع نہیں ہو گا۔ مثلاً، اگر کوئی شخص اعلاء کلمۃ اللہ کی نیّت سے جہاد پر نکلے ساتھ ہی مالِ غنیمت حاصل کرنے کی نیّت بھی شامل ہو تو ایسی صورت میں اجر میں کمی تو واقع ہو گی لیکن جہاد کا اجر ملے گا۔ عبد اللہ ابنِ عمروؓ کی روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا" اگر ایک مجاہد کچھ مالِ غنیمت حاصل کرتا ہے تو اسے اس کے اجر کا ایک تہائی حصہ دیدیا گیا" (مسلم)۔ اور دوسری حدیث میں یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص دنیاوی غرض سے جہاد کیلیئے گیا تو اس کیلیئے ایسے جہاد کا کوئی اجر نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کا مفہوم کچھ یوں ہو گا کہ صرف دنیاوی مقصد کیلیئے جہاد کا کوئی اجر نہیں۔ امام احمد کہتے ہیں کہ ہر ایک کو اس کے مطابق جہاد کا اجر ملے گا جتنی کہ اس کی نیّت جہاد کیلیئے ہو گی اس حال میں بھی کہ اس کی نیّت میں کچھ اور نیّت بھی ملی ہوئی ہو۔ لیکن ایسے شخص کا جہاد جو خالصتاً اللہ تعالیٰ کیلیئے ہو اس کا اجر سب سے زیادہ ہے۔[2]

---

[1] ابنِ رجب، جامی، جلد1، ص۔81۔

[2] دیکھیں ابنِ رجب، جامی، جلد1، ص۔82۔

اگر کسی شخص کی نیّت خاص اللہ تعالیٰ کیلئے تھی لیکن دورانِ عمل نیّت بدل گئی، جیسا کہ لوگوں کو دکھانے کی نیّت، تو کیا ایسی صورت میں اس کا عمل مکمل طور پر ضائع ہو گیا؟ اگر یہ صرف ایک سوچ تھی جو اس کے ذہن میں آئی لیکن اسے فوراً ہی جھٹک دیا تو اس کے عمل کو اس کا کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اصل سوال یہ ہے کہ اگر یہ سوچ اس کے ساتھ لگی رہی تو اس سلسلے میں امام احمد اور ابنِ جریر الطبری دونوں کہتے ہیں کہ وہ امید کرتے ہیں کہ ایسے معاملے میں پھر بھی جزا پائے گا اپنی ابتدائی نیّت کی وجہ سے۔ الطبری یہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں کہ اس طرح کا معاملہ ان اعمال کیلئے ہے جو حصوں میں تقسیم نہیں کیے جاسکتے جیسا کہ نماز اور روزہ، جبکہ تلاوتِ قرآن یا ذکر جیسے اعمال جو کہ حصوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں تو ان کی جزا وہیں ختم ہو جائے گی جہاں اس کی نیّت بدلی۔[1]

{اس کے بر خلاف صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ابتدائی نیّت میں ریا یا کوئی دنیاوی مقصد کار فرما ہو لیکن عمل کے دوران نیّت کو درست کر لیا۔ مثلاً، جہاد کے لیے نکلتے وقت تو نیّت میں خلل تھا تاہم بعد ازاں اسے درست کر لیا؛ یا ان لوگوں کی مثال جو غیر اسلامی خصوصاً مغربی ممالک میں دنیا کمانے کی نیّت سے جا کر آباد ہوئے تاہم انہیں وہاں اللہ کی ہدایات مل گئی اور انہوں نے اپنی نیّت کو درست کر لیا(اس طرح کی متعدّد مثالیں ملتی ہیں) اور اپنے عمل کو بھی اس کے مطابق کر لیا مثلاً دعوت و تبلیغِ اسلام وغیرہ کو اپنا مقصد بنالیا تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ سے قوی امید ہے کہ اس کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہو گی۔ (مترجم)}

آخر میں ایسے شخص کا معاملہ جس نے عمل تو خالصتاً اللہ کیلئے کیا لیکن بعد میں اسے لوگوں نے سراہا اور اسکی شہرت اس عمل کی وجہ سے ہوئی، تو اللہ کی طرف سے اس کو ملنے والے اجر

---

[1] دیکھیں ابنِ رجب، جامی، جلد1، ص۔83۔

میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ رسول ﷺ سے ایسے شخص کے متعلّق سوال کیا گیا جو اللہ کی خاطر ایک عمل کرتا ہے اور بعد میں لوگ اسے سراہتے ہیں، رسول ﷺ نے فرمایا،

تلک عاجل بشری المومن۔

"یہ جلدی مل جانے والا حصہ ہے خوشخبری کا جو ایک مومن کو ملتا ہے۔" (مسلم)

نیّت اور مُباح اعمال

فقہا کے مطابق ایک (مُباح) عمل، ایسا عمل جس کی اجازت ہو لیکن اللہ کے ہاں نہ اس کے کرنے کا کوئی ثواب ہو اور اگر یہ عمل نہ کیا جائے تو کوئی گناہ بھی نہ ہو۔ یہ فقہا کی طرف سے آئی ہوئی ایک لگی بندھی تعریف ہے اور یہ تعریف کچھ غلط بھی نہیں۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ مُباح عمل پر اللہ تعالیٰ سے جزا بھی مل سکتی ہے اگر یہ عمل اس نیّت سے ہو کہ یہ ایسا عمل ہے جس کی اجازت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی قُربت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ مثلاً، اگر کوئی کھانا اس نیّت سے کھاتا ہے کہ اس سے توانائی ملے تاکہ وہ اپنے مذہبی فرائض ادا کر سکے تو ایسی صورت میں اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر ملے گا، ایک ایسے عمل پر جسے فقہا مُباح عمل قرار دیتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ قرونِ اولیٰ کے بعض مسلمان آرام صرف اس غرض سے کرتے تھے کہ دوبارہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں محنت کیلئے تیار ہو سکیں۔

اپنی دنیاوی ذمہ داریاں مُباح اور شرعی انداز میں ادا کرنا بھی اللہ سے اجر کمانے کا ذریعہ ہے، رسول ﷺ نے فرمایا،

ولن تنفق نفقۃ تبتغی بھاوجہ اللہ الا اجرت علیھا حتی ماتجعل فی فی امراتک۔

"تم اللہ کی خوشنودی کیلئے کچھ خرچ نہیں کرتے مگر اس کا اجر تمہیں ملے گا یہاں تک کہ

اس لقمے کا بھی جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتے ہو۔" (البخاری و مسلم[1])

مدارج السّالکین میں ابنُ القیّم لکھتے ہیں "لوگوں میں سے ممتاز (گروہ) لوگ جو اللہ کے قریب ہو جاتے ہیں وہ ہیں جو اپنے مُباح اعمال کی نوعیّت کو اس طرح تبدیل کر دیتے ہیں کہ وہ اللہ کی عبادت کے اعمال بن جاتے ہیں" مزید لکھتے ہیں کہ "اللہ کی معرفت رکھنے والوں کے روز مرّہ کے روایتی اعمال ان کیلئے اعمالِ عبادت بن جاتے ہیں جبکہ اعمالِ عبادت بھی لوگوں کی ایک بڑی اکثریت کیلئے روز مرّہ کے روایتی اعمال بن کر رہ جاتے ہیں۔"[2]

جو کہا گیا وہ سچ ہے، مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت کا رویّہ نماز اور روزے اور دوسرے اعمال میں ایسا ہوتا ہے کہ یہ عام روز مرّہ کی مصروفیات کی طرح بن کر رہ جاتے ہیں اور وہ صرف اس لیے یہ اعمال کیا کرتے ہیں کہ یہ معاشرتی روایات اور زندگی کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔ ان کے دلوں میں کوئی خاص نیّت یا احساس اپنے عمل کو اللہ کیلئے کرنے سے متعلّق نہیں ہوتا، اگر عمل کی ادائیگی کا معیار ناقص ہے تو اس سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لیے کہ یہ عمل محض خانہ پُری کیلئے ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ایسے اہم افعالِ عبادت محض روایتی افعال بن کر رہ جاتے ہیں جس کے کوئی معنی یا اثر باقی نہیں رہتا۔ معرفتِ الٰہی کے حامل فرد کا معاملہ یکسر مختلف ہے اس کے دنیاوی اعمال جو وہ کرتا ہے ایک مقصد سے بھرپور ہوتے ہیں، اس طرح یہ اعمالِ عبادت بن جاتے ہیں جو اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ بنتے ہیں۔

اسی طرح سے امام النووی اس حدیث کے بارے میں جس میں ایسے شخص کے لیے جزا

---

[1] امام النووی نے اس حدیث کی تفسیر لفظ شناسی کے پیرائے میں کی۔ امام فرماتے ہیں کہ بیوی کے منہ میں لقمہ ڈالنے جیسا عمل ایسی صورت میں ہی ممکن ہے جبکہ زوجین ایک دوسرے کے قریب ہوں اور ایک دوسرے کی رفاقت سے محظوظ ہو رہے ہوں ایسی حالت میں بھی اگر یہ عمل اس نیّت کے ساتھ کیا ہو کہ یہ ایک مُباح عمل ہے تو اسکی جزا اللہ سے ملے گی۔

[2] صالح العلیوی، مباحث فی النیّۃ (اشاعت سے متعلّق کوئی معلومات نہیں دی گئیں) ص۔15۔

کا ذکر ہے جو اپنی بیویوں سے ہمبستری کرتا ہے فرماتے ہیں" یہ حدیث اس بات کا ثبوت ہے کہ مُباح اعمال فرمانبرداری کے اعمال بن جاتے ہیں اگر ان کے ساتھ نیک نیّت شامل ہو۔ یعنی ہمبستری بھی (اللہ کی) فرمانبرداری کا عمل بن جائے گی اگر نیّت بیوی کے حقوق کی ادائیگی اور اللہ کی ہدایت کے مطابق بیوی سے حسنِ سلوک روا رکھنے کی ہو؛ یا اس عمل میں ایک ضرورت پوری کرنے کی یا اپنی بیوی کی ضرورت پوری کرنے کی نیّت ہو، تاکہ اس کے ذریعے حرام سے دور رہنا اور ایسے اعمال کو دیکھنے سے دور رہنا اور اسی طرح کے دوسرے اعمال سے بچنا مقصود ہو۔"[1]

لہٰذا، ایک مسلمان کی حتی الامکان کوشش ہونی چاہیے کہ اپنی استطاعت کے مطابق ہر عمل کو مکمل طور پر سوچ سمجھ کے ساتھ ادا کرے۔ یہ سوچ کہ وہ کیا کرنے جارہا ہے، اس سے پہلے کہ وہ عمل کرے اسے اپنے عمل کے مقصد اور اپنے مطمحِ نظر کے بارے میں سوچنا چاہیے، اس سے قطع نظر کہ کس طرح کا عمل ہے۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ عمل کتنا دنیاوی ہے، اگر ایک شخص یہ سوچ لے کہ یہ عمل کیوں اور کس کیلئے کر رہا ہے تو ایسا کرنے سے وہ اس عمل کو اللہ کی عبادت کے دائرے میں داخل کر سکتا ہے۔

کیا ایک شخص اپنی نیّت کو قابو میں رکھ سکتا ہے؟

امام غزالی نے لکھا،

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ چند لاعلم لوگ نیّت کی درستگی کے متعلّق ہماری بات سنتے ہیں اور رسول ﷺ کی حدیث " یقیناً اعمال کا دارومدار نیّتوں پر ہے" سنتے ہیں اور تعلیم حاصل کرتے وقت، کاروباری معاملات کرتے ہوئے یا کھاتے وقت یہ کہہ

---

[1] النووی، شرح صحیح۔

دیتے ہیں ”میری نیّت اللہ کی خاطر تعلیم حاصل کرنے کی ہے“ یا ”اللہ کی {رضا کی} خاطر کھاتا ہوں“ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہی نیّت ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے، ایسا کرنا تو یوں ہے کہ ایک شخص اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو یا زبان سے کچھ الفاظ ادا کر رہا ہو ایک خیال یا ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک کی حرکت کر رہا ہو۔ نیّت تو ان سب سے الگ معاملہ ہے۔ نیّت تو ایک انسان میں کسی مقصد کے حُصول کی تحریک پیدا کرتی ہے، جو یا تو فوراً ظاہر ہو یا مستقبل میں اس کا ظہور ہو۔ یہ تحریک وہ خود پیدا نہیں کر سکتا نہ اپنے اندر اجاگر کر سکتا ہے۔ یہ تو ایسا ہو گا کہ ایک شخص کا پیٹ بھرا ہوا ہو اور وہ کہے ”میری نیّت ہے کہ میں کھانے کی نیّت کروں“ اور اس کے بعد وہ کھانے کیلئے چلا جائے، یا ایسے کہ ایک بے عمل بیٹھا ہوا آدمی یوں کہے کہ ”میری نیّت ہے کہ میں فلاں سے محبّت کروں“ یہ ایک بے مقصد بات ہو گی۔[1]

ابنِ خلدون فرماتے ہیں کہ لوگوں کی اکثریت عام طور پر اپنے اعمال کے سلسلے میں اپنی اندرونی کیفیت (یعنی نیّت) پر قابو نہیں رکھتی۔ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو یہ حکم کیوں دیتا کہ اپنی نیّتوں کو خالص کر لو اور ان کے اعمال کے بارے میں فیصلہ بھی اس نیّت کے مطابق ہی کیوں کرتا؟[2] اس سوال کا جواب الشاطبی نے ان الفاظ میں دیا،

---

[1] حوالہ در الاشقر، مقاصد، ص۔31۔

[2] اس سوال کے جواب کی ضرورت صرف اس صورت میں ہو گی اگر امام غزالی اور ابنِ خلدون کے اقوال درست تصوّر کیے جائیں۔ عمر الاشقر نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ ایسے تجربے ہوئے ہیں جو ان اقوال کے خلاف جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر پیٹر لینگ (Peter Lang) نے جامعہ پٹز برگ (Pitzburg) میں یہ تجربہ کیا کہ چند اشخاص کو جب فی منٹ اپنے دل کی دھڑکنوں کی تعداد کو قابو کرنے کے لیے کہا گیا تو وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی طرح المود اور گرین (Ilmud and Green) نے کینساس (Kansas) میں یہ تجربہ کیا کہ چند عورتوں اور بچوں کو اپنے ذہن کی مدد سے اپنے ہاتھوں کی حدّت کو قابو کرنے کیلئے کہا اور کچھ دیر میں وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ الاشقر اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان تجربات کی روشنی میں ایک نئ

اگر اللہ کسی ایسی چیز کا حکم دے جو ظاہری طور پر انسان کی دسترس سے باہر ہو تو اس صورت میں ایسے حکم کو سیاق و سباق کے حوالے سے دیکھا جائے (تاکہ اس حکم کو صحیح طور پر سمجھا جاسکے،) مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان "کہ تمھیں موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ تم مومن ہو" اور وہ حدیث جس میں ہے کہ "اللہ کے ایسے بندے بنو جو مارا جائے نہ کہ ایسے جو قتل کرے" اور رسول صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے یہ بھی فرمایا کہ "ایسی حالت میں تمھیں موت نہ آئے کہ تم ظالم ہو" اور اسی طرح کی اور مثالیں {کُتب حدیث میں ملتی ہیں}۔ لیکن غور کریں تو انسان کو وہی کچھ حکم دیا جارہا ہے جس کے کرنے کی وہ استطاعت رکھتا ہے (ان مثالوں میں) اسلام کی پیروی کرنے، ظلم سے بچنے، قتل کرنے سے اجتناب اور اللہ کے حکم کی تعمیل میں سر جھکا دینے اور ان جیسے دوسرے احکام میں ایسی ہی صورت ہو گی۔[1]

{ابنِ خلدون کے جس بیان کا حوالہ اوپر دیا گیا اس میں ابنِ خلدون نیّت کے خالص کر لینے کو ناممکن عمل قرار نہیں دیتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ایسا کرنا اکثریت کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ کئی اور بھی ایسے اعمال ہیں جن کا کرنا مسلمانوں کی اکثریت کے لیے آسان نہیں ہوتا اور یہ اعمال آخرت کی درجہ بندی میں لوگوں کے مقام کا تعیّن کرنے میں اہم ہونگے، جیسا کہ سورۃ الواقعہ کی ابتدائی آیات میں ہے کہ گروہِ سابقون میں بعد کے آنے والوں میں سے کم ہی لوگ شامل ہونگے۔ اس بنا پر ہماری رائے میں ابنِ خلدون کے بیان پر یہ تنقید بے جا ہے،

تحقیق اس سوال پر ہونی چاہیے کہ کیا نیّت کو قابو میں رکھا جاسکتا ہے یہ اسلیے اور اہم ہو جاتا ہے کہ ہمیں امام غزالی اور ابنِ خلدون کے اقوال کی معاونت میں کوئی تحریری ثبوت نہیں ملتے (الاشقر، مقاصد، ص۔40) آگے چل کر السدلان نے اس معاملے میں جو بحث کی ہے اسے پیش کیا گیا ہے اور اسے ایک مناسب جواب تصوّر کیا جاسکتا ہے۔

[1] حوالہ در الاشقر، مقاصد، ص۔41۔

دراصل الشاطبی کا بیان اس پر اضافہ ہے اس کے خلاف یا اس کا جواب نہیں۔ مزید یہ کہ ہماری رائے کی معاونت پچھلے صفحوں میں موجود ابنُ القیّم کے اس قول سے بھی ہوتی ہے "اللہ کی معرفت رکھنے والوں کے روز مرّہ کے روایتی اعمال ان کیلئے اعمالِ عبادت بن جاتے ہیں جبکہ اعمالِ عبادت بھی لوگوں کی ایک بڑی اکثریت کیلئے روز مرّہ کے روایتی اعمال بن کر رہ جاتے ہیں"۔ واللہُ اعلم بالصواب (مترجم)}

درحقیقت یوں لگتا ہے کہ امام غزالی کا بیان کہ " یہ تحریک نہ انسان خود اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے اور نہ اجاگر کر سکتا ہے" پوری طرح درست نہیں۔ ایسی تحریک پیدا کرنے کے ذرائع ہیں۔ اس نکتے پر السّدلان کا ایک بہت اہم بیان ہے جو تفصیل سے پیش کرنے کے لائق ہے، اسے حدیث کی تشریح کے آخر میں ضمیمہ نمبر 2 کے تحت رکھ دیا گیا ہے۔

{اُوپر دی گئی اختلافی آراء اور ضمیمہ نمبر 2 میں پیش کی گئی معلومات سے قطع نظر یہ بات عام طور پر تجربے اور مشاہدے میں بھی آتی ہے کہ اخلاصِ نیّت کی کیفیت کو مسلسل قائم رکھنا آسان کام نہیں۔ تاہم، آگے آنے والی سطور میں ان طریقوں کا بیان ہے جو اس کام کو آسان بنانے میں مددگار ہوسکتے ہیں۔ ایک اہم عنصر جو اس سلسلے میں توجّہ طلب ہے وہ یہ ہے کہ نیّت کو درست رکھنے کی جدوجہد کے نتیجے میں ایک شخص بے عملی کی طرف راغب نہ ہو جائے، اس سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جس طرح نیّت عمل پر اثر انداز ہوتی ہے ایک اچھا عمل بھی نیّت کو درست کرنے میں معاون ہو سکتا ہے۔ لٰہذا، نیّت میں کچھ کمزوری بے عملی کا سبب نہیں بنی چاہیے۔ واللہُ اعلم بالصواب۔ (مترجم)}

لٰہذا، ایک مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اخلاص باللہ کی پوری کوشش کرے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے وہ تمام ذرائع استعمال کرے جو اسے اللہ تعالیٰ سے قریب کر دیں۔ جیسا کہ اس کی تخلیقات اور اس کی نعمتوں پر غورو فکر کرکے اور اس کی صِفات سے

آشنائی حاصل کر کے، معرفتِ الٰہی کی کوشش۔ اس طرح انسان اللہ کی اطاعت کی طرف زیادہ راغب ہو گا اور اس سے زیادہ سے زیادہ مخلص رہے گا۔ اگر یہ اخلاصِ نیّت اس پر چھاجائے تو اس کا دل اللہ کی محبّت سے بھر جائے گا، اس میں اللہ کا خوف ہو گا اور اسی سے امید ہو گی، اِس طرح اُس کیلئے یہ آسان ہو جائے گا کہ اُس کی خواہش کرے جس کے کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہو، اور خالصتاً اس کی راہ میں جدوجہد کرے۔ اس صورت میں اس کی نیّت خالص اللہ کی بندگی کی ہو گی اور اس کا نفس بغیر کسی کوشش کے اُسے اس طرف راغب کرے گا جن کاموں سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے۔

ایک انسان کو اس مقام تک پہنچنے کیلئے ان تمام عوامل کا اِدراک حاصل کرنا ہو گا جو اس کے دل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کو جاننے والا یہ بھی جان لے گا کہ کہاں سے مدد ملے گی اور اسے ان عوامل کا بھی اندازہ ہو جائے گا جو اس کیلئے مشکل پیدا کر سکتے ہیں اور اس کے سیدھی راہ سے بھٹک جانے کا سبب بن سکتے ہیں۔ الحارث المحاسبی نے لکھا کہ انسان کے دل پر تین طرح کی قوّتیں کار فرما ہوتی ہیں۔[1]

پہلی الہامی اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی قوّت جو اللہ نے ایمان والوں کے دلوں میں ڈال دی ہے، ایک حدیث میں آیا ہے:

ضرب اللہ مثلا صراطا مستقیما و علی جنبتی الصراط سوران فیهما ابواب مفتحة و علی الابواب ستور مرخاة وعلی باب الصراط داع یقول ایها الناس ادخلوا الصراط جمیعا ولا تتفرجوا وداع یدعو من جوف الصراط فاذا اراد یفتح شیئا من تلک الابواب قال ویحک لا تفتحه فانک ان تفتحه تلجه و الصراط الاسلام و السوران حدود اللہ تعالی والابواب

---

[1] دیکھیں الاشقر، مقاصد، ص ص۔361 کا زیریں حاشیہ، یہ تین اقسام المحاسبی نے بیان کی ہیں لیکن یہاں پر موجود بحث المحاسبی کی بحث کے مطابق نہیں۔

المفتحۃ محارم اللّٰہ تعالی وذلک الداعی علی راس الصراط کتاب اللّٰہ عزوجل والداعی فوق الصراط واعظ اللّٰہ فی قلب کل مسلم۔

"اللہ نے سیدھے راستے کی تمثیل بیان کی جس کے دونوں جانب دیواریں ہیں جن میں کھلے ہوئے دروازے ہیں ان کھلے ہوئے دروازوں پر پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ اس راستے کے سرے پر ایک پکارنے والا کہہ رہا ہے' تمام لوگ راستے پر سیدھے چلیں اور باہر نہ نکلیں۔' اس کے اوپر ایک اور پکارنے والا ہے جب کوئی شخص دروازہ کھولتا ہے تو وہ کہتا ہے' ہلاکت ہو تجھ پر اسے مت کھولو۔ اس لیے کہ اگر تم اسے کھولو گے تو تم اس میں داخل بھی ہو گے' یہ راستہ اسلام ہے اور یہ دروازے وہ چیزیں ہیں جن سے اللہ نے روکا ہے اور جو پردے لٹک رہے ہیں، یہ وہ حدود ہیں جو اللہ نے مقرر کی ہیں۔ راستے کے سرے پر پکارنے والا قرآن ہے اور اس کے اوپر وہ ہے جو تنبیہ کر رہا ہے اللہ تعالیٰ کیلئے اور یہ ہر مسلمان کے دل میں ہوتا ہے۔"[1]

یہ وہ پہلی طاقت ہے جو انسان کے دل کو اللہ کے لیے خالص کرنے میں مددگار ہوتی ہے اس کے بعد اگر وہ اللہ کی جانب رُخ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ اس کی طرف متوّجہ ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ دو اور قوّتیں ہیں جو انسان کے دل پر کارفرما رہتی ہیں، شیطان کی سرگوشیاں اس کے بہکاوے، اور نفسِ انسانی بذاتِ خود۔ کبھی اللہ تعالیٰ کی راہ سے بھٹکانے والی شیطان کی سرگوشیاں ہوتی ہیں اور کبھی وہ خواہشات اور جذبات ہوتے ہیں جو انسان اپنے نفس میں پیدا کر لیتا ہے۔

شیطانی وسوسوں کے بارے میں مزید یہ ہے کہ اگر بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا

---

[1] احمد نے اسے محفوظ کیا۔ الالبانی کے مطابق یہ صحیح ہے۔ الالبانی، صحیح الجامع، جلد2، ص ص۔ 772-771۔

ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل پر سے شیطان کے اثر کو زائل کر دیتے ہیں،

وَ اِمَّا يَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ۔

"اگر کبھی شیطان تمہیں اُکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو، وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔" (الاعراف:200)

ایک بار پھر اس بات کو سمجھ لیں کہ اگر بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل سے شیطانی وسوسوں کو ہٹا دیتے ہیں۔

جب نفس انسان کو بُرے کام کی طرف پھیرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس معاملے کو ایسے بیان فرمایا:

اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّىۡ ؕ اِنَّ رَبِّىۡ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۔

"نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے اِلّا یہ کہ کسی پر میرے ربّ کی رحمت ہو، بے شک میرا ربّ بڑا غفور ورحیم ہے۔" (یوسف:53)

تو پھر ایک انسان کیلئے ضروری ہے کہ وہ ان قوّتوں کا اِدراک رکھے جو اس کے دل پر کارفرما رہتی ہیں۔ وہ ہمیشہ ہوشیار رہے اور کبھی ان کو نظر انداز نہ کرے۔ اگر وہ ان کو نظر انداز کرے گا تو وہ اپنی زندگی کے واحد مقصد یعنی اللہ تعالیٰ کی سچی اور مخلص بندگی سے دور ہو جائے گا۔ اُسے چاہیے کہ ہمیشہ ایسے کام کرے جن سے اس کا ایمان مضبوط ہو اور وہ بھٹکنے سے محفوظ رہے۔{اپنا اور اپنے گھر والوں کا میل جول ایسے لوگوں کے ساتھ بڑھائے جو اللہ کے قریب ہوں اور اس کی راہ میں سرگرمِ عمل ہوں۔(مترجم)}۔ اسے چاہیے کہ وہ ہمیشہ اپنا رُخ اللہ تعالیٰ کی طرف رکھے اور اس سے ہدایت مانگے، اس میں کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی راہ میں اخلاص اور پاکیزگی عطا فرمائے۔

یہ حدیث عمل سے پہلے علم کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتی ہے

یہ حدیث صاف طور پر ظاہر کرتی ہے کہ ایک مسلم کے پاس عمل سے پہلے اس کا درست علم ہونا ضروری ہے۔ ایک شخص کسی مناسب عمل یا کم از کم مُباح عمل کو کرنے کیلئے ضرور نیّت کرتا ہے۔ لیکن ایسا کرنا اس کیلئے ممکن نہیں جب تک اُسے اس بات کا اِدراک نہ ہو کہ یہ عمل مُناسب یا مُباح ہے۔ اگر کوئی شخص ایک عمل کے بارے میں حکمِ الٰہی جانے بغیر وہ عمل کرتا ہے، ایسی صورت میں وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی نیّت خالص اللہ تعالیٰ کیلئے ہے۔ اس کی نیّت کی کیفیت اس پر منحصر ہو گی کہ اسے اس عمل کے بارے میں علم ہو اور اس پر کہ یہ عمل جائز ہے یا نہیں۔ اگر اس نے یہ خیال نہ کیا کہ یہ عمل جائز ہے یا نہیں، تو اس نے یہ عمل لاپروائی سے کیا۔ یعنی اس کی نیّت یہ تھی کہ اسے اس بات کی پروا نہیں کہ یہ عمل جائز ہے یا نہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں،

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۔

”پس جو کوئی اپنے ربّ کی ملاقات کا امیدوار ہو اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے ربّ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے۔“ (الکھف:110)

اس آیت پر تبصرہ کرتے ہوئے ابنُ القیّم لکھتے ہیں،

یہ صرف ان اعمال کے بارے میں ہے جنہیں اللہ تعالیٰ قبول کرے گا۔ یہ اعمال رسول ﷺ کی سنّت کے مطابق ہوئے ہوں گے اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے کیے گئے ہوں گے۔ ایک عمل کرنے والا ان دونوں شرائط کو پورا نہیں کر سکتا جب تک اس کے پاس علم نہ ہو، اگر اسے معلوم ہی نہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے کیا روایت ہوا ہے تو اُس کی نیّت کیسے کرے گا۔ اگر اُسے اس بات کا

اِدراک ہی نہ ہو کہ وہ کس کی عبادت کرتا ہے تو وہ اس کیلئے خالص نیّت نہیں کر سکتا۔ اگر علم نہ ہو تو عمل بھی قابلِ قبول نہ ہو گا۔ یہ علم ہی ہے جو بتاتا ہے کہ رسول ﷺ کی صحیح پیروی کا طریقہ کیا ہے۔[1]

درست نیّت اور غلط نتائج

انسان کی نیّت عمل کی جزا کا تعیّن کرتی ہے اس کے باوجود کہ عمل کا نتیجہ وہ نہ نکلے جس کی عمل کرنے والے نے خواہش کی ہو۔ رسول ﷺ کے زمانے میں ایک باپ نے کچھ صدقے میں دیا، جو صاحب صدقات کی تقسیم پر معمور تھے انہوں نے انجانے میں وہی صدقہ اس شخص کے بیٹے کو دیدیا۔ باپ نے رسول ﷺ سے کہا "میری یہ خواہش نہیں تھی کہ یہ اس کو ملے" رسول ﷺ نے فرمایا "تمہارے لیے وہی ہے جس کی تم نے نیّت کی" اور بیٹے کو کہا "تمہارے لیے وہ ہے جو تمہیں ملا" (البخاری)۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کو یہ سمجھ کر صدقہ دے کہ یہ مستحق ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہو، اس کے باوجود صدقہ دینے والے کو اس کی نیّت کی بنا پر اجر ملے گا۔ اس سے ایک بار پھر نیّت کے مقام اور اہمیت کی تصدیق ہوتی ہے۔

درست نیّت عبادت کی ایک بہت اعلیٰ شکل ہے

کسی عمل کے پیچھے موجود نیّت ایسی چیز ہے جس کا علم یا تو اس شخص کو ہوتا ہے جو عمل کرنے والا ہے یا اللہ تعالیٰ کو۔ یہ ایک طرح کا راز ہے بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان، یہ ایک ایسی چیز ہے جس میں دکھاوے کا عنصر شامل نہیں ہوتا، نیّت کے برخلاف ظاہری عمل کو اور

---

[1] یہ حوالہ دیا گیا علی الصالحی، الضوء المنیر علی التفسیر (ریاض: معاملات النور، تاریخ ندارد) جلد 4، ص۔173 سے۔

لوگ بھی دیکھتے ہیں، اس لیے نیّت کا اجر بہت زیادہ ہے کیونکہ اس سے کسی دنیاوی فائدے کی توقع نہیں کی جاسکتی، شاید یہ ہی سہل ابنِ عبد اللہ کا مطلب تھا جب انہوں نے کہا" نفس کیلئے کوئی چیز اتنی مشکل نہیں جتنا کہ اخلاص کیونکہ نفس کو اس میں سے کچھ نہیں ملتا۔"[1]

نیّت اور اخلاص کسی بھی معاملے کا قلب ہوتے ہیں

نیّت اور اخلاص کی اہمیت کے بارے میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہی وہ کلیدی نکتہ ہے جسکے گرد تمام مخلوقات گردش کرتی ہیں۔ یہی انسان کا ہدف اور مطمحِ نظر ہونا چاہیے اوراس کے مابعد کوئی ہدف یا مطمحِ نظر نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔

"میں نے جن اور انسانوں کواس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری ہی بندگی کریں۔" (الذرّیات:56){یعنی نہ صرف پرستش بلکہ غلامی واطاعت بھی۔}

اخلاصِ نیّت درحقیقت اللہ کی صحیح طریقے سے عبادت کرنے اور اس کی صحیح طریقے سے عبادت نہ کرنے کے درمیان نکتۂ تفریق ہے۔ اور یہ بھی کہ یہ وہ تفریق ہے جو واحد اللہ کی عبادت کرنے والے اور اللہ کی عبادت میں اوروں کو بھی شریک کرلینے والے کے درمیان پائی جاتی ہے۔

ابنِ خضم نے کہا"نیّت بندگی کا راز ہے اور اس کی روح ہے۔ اس کی حیثیت عمل کے ساتھ ایسی ہی ہے جیسے روح کی بدن کے ساتھ، ایسا سوچنا بھی ممکن نہیں کہ بندگی کا کوئی عمل اس کی

---

[1] حوالہ درابنِ رجب، جامی، جلد1، ص۔84یہی ایک توجیہہ ہے جسکی بنیاد پر سہل ابنِ عبد اللہ کے قول کو درست مانا جاسکتا ہے دوسری صورت میں اسے مسترد کرنا ہوگا کیونکہ روح کو اخلاص سے بہت کچھ ملتا ہے جس میں ایمان میں اضافہ اور آخرت کی جزا بھی شامل ہے واللہُ اعلم بالصواب۔

روح کے بغیر ہو۔ ایسی صورت میں یہ ایک بے جان بدن کی سی مثال ہو گی"[1] الاشقر کہتے ہیں،

وہ سچ جس کی تصدیق قرآن اور سنّت سے ہوتی ہے یہ ہے کہ اصل چیز جس پر شریعت کے احکام صادر ہوتے ہیں وہ نفس ہے اور بدن تو صرف ایک اوزار ہے نفس کیلئے۔ اگر عمل اس کے بغیر ہے جس کا حکم نفس کو دیا گیا، یعنی اخلاصِ نیّت، تو پھر ایسا عمل ایک بے کار کا کھیل تماشا اور گمراہی ہے۔[2]

اللہ اپنے بندوں سے دل کی پاکیزگی چاہتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس پاکیزگی کا اظہار عمل میں بھی ہوتا ہے لیکن یہ نیّت کی پاکیزگی ہی ہے جو کسی عمل کے ذریعہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے امتحان کیلئے موت اور زندگی بنائے تاکہ یہ دیکھے کہ کون اپنے اعمال میں بہتر ہے۔ اس نے بندوں کو اس لیے نہیں بنایا کہ دیکھے کہ کون زیادہ اعمال کرتا ہے جبکہ معیار کے اعتبار سے وہ کم ترین معیار والے اعمال ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ ۙ وَ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۔ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۔

"نہایت بزرگ و برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں (کائنات کی) سلطنت ہے، اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو اِیجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے، اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی۔" (الملک 2-1)

اس آیت کے بارے میں الفُدیل ابنِ عیاد نے لکھا ہے۔ "اعمال میں سے بہترین" کے

---

[1] حوالہ درالاشقر، مقاصد، ص ص۔ 69-68۔

[2] الاشقر، مقاصد، ص۔ 69۔

معنی بہت زیادہ پاکیزہ اور درست اعمال ہیں اور مزید بیان کیا کہ "اگر ایک عمل مخلصانہ ہے اور بظاہر اچھا ہے لیکن درست نہیں تو ایسا عمل بھی مقبول نہیں اور اگر عمل درست ہے لیکن اخلاص سے عاری ہے تو ایسا عمل بھی مقبول نہیں جب تک وہ خاص اللہ کیلئے نہ ہو اور وہ درست ہو گا جب وہ سنّت کے مطابق ہو گا۔"[1] یہ بات اللہ کے اس بیان سے اور واضح ہو جاتی ہے،

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۔

"اے نبی ﷺ، کہو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے، پس جو کوئی اپنے ربّ کی ملاقات کا امیدوار ہو اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے ربّ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے۔" (الکہف:110)

رسول ﷺ نے فرمایا،

ان اللّٰہ لا ینظر الی صورکم واموالکم و لکن ینظر الی قلوبکم واعمالکم۔

"اللہ تمہاری صورتوں کو یا تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا لیکن وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔" (مسلم)

یہی تمام انبیا کا طریقہ تھا اور اس کے کرنے کا حکم تمام انسانیّت کے لیے ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ۔

---

[1] حوالہ در ابنِ رجب، جامی، جلد1، ص۔72۔

"اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے بالکل یکسو ہو کر، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، یہی نہایت صحیح اور درست دین ہے۔"(البینۃ:5)

لہٰذا، ظاہری عمل اور اسکا باطنی پہلو دونوں اہم ہیں۔ سب سے اہم پہلو وہ تحریک ہے جو دل سے ملتی ہے اور اسے ہم مذکورہ حدیثِ رسول ﷺ کے تناظر میں سمجھ سکتے ہیں" یقیناً اعمال کا انحصار نیّتوں پر ہے" ابنُ القیّم ایک جگہ یوں لکھتے ہیں،

جو کوئی شریعت کے ماخذات کا علم حاصل کرے گا وہ اس تعلّق کا اِدراک حاصل کرے گا جو جوارح کے ظاہری اعمال اور دل کے عوامل کے درمیان ہوتا ہے۔ اعمال (فائدہ مند) نہیں ہوتے دل کے اعمال کے بغیر۔ دل کے اعمال انسان کیلئے جوارح کے اعمال کی بنسبت زیادہ اہم فریضہ ہیں ۔ کیا یہ درست نہیں کہ ایک مومن اور ایک منافق کا فرق دل کے عمل ہی کی بنا پر ہے جو ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں؟ کیا کوئی اسلام میں داخل ہو سکتا ہے دل کے عمل کے بغیر اس سے پہلے کہ جوارح عمل کریں؟ دلوں کی بندگی اور عبادت بڑی اور دیرپا ہوتی ہے بنسبت جوارح کی بندگی کے، یہ ہمیشہ فرض ہوتی ہے۔ اس لیے ایمان ہمیشہ کیلئے فرض ہے دلوں پر، جبکہ جوارح کی مخصوص عبادات خاص اوقات میں فرض ہوتی ہیں۔ ایمان کا مسکن دل ہے جبکہ جوارح کی بیرونی عبادت اسلام سے تعلّق رکھتی ہے۔[1]

[1] حوالہ در شمس الدین ابنُ القیّم، بدائع الفوائد، جلد3، ص۔230۔

جنّت اور دوزخ کی ہمیشہ کی زندگی کیلئے نیّت کلیدی حیثیت رکھتی ہے

کچھ لوگ سوال کرتے ہیں؛ ایسا کیوں ہے کہ کفّار ہمیشہ کیلئے جہنم کی سزا پائیں گے حالانکہ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے نافرمان نہیں رہے؟ اِسی طرح سے ایمان والوں کے لیے جنّت کی نعمت ہمیشہ کیلئے کیوں ہے جبکہ وہ اللہ کے فرمانبردار صرف اپنی زندگی کے ایک حصہ میں ہی تھے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کافروں کی نیّت ہمیشہ کیلئے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تھی اور ایمان والوں کی نیّت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی تھی۔ اسلیے ان کو اپنی نیّتوں کے مطابق بدلہ ملا۔ جیسا کہ القاری نے نشاندہی کی کہ، جنّت میں داخلہ ایمان کے سبب ہے اور جنّت کے درجات اعمال سے وابستہ ہیں اور وہاں ہمیشہ کا قیام اس بنا پر ہے کہ ایک شخص کی نیّت ساری زندگی اللہ کی فرمانبرداری کرنے کی تھی۔ اسی طرح جہنم میں داخلہ کفر کے سبب ہے جبکہ اسکے درجات بُرے کاموں سے وابستہ ہیں اور وہاں ہمیشہ کا قیام اس بنا پر ہے کہ ایک شخص کی نیّت ساری زندگی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تھی۔[1]

کفّار سے اچھے اعمال بھی ہوتے ہیں جو اچھے بھی ہوتے ہیں اور دوسروں کیلئے اچھے نتائج کا سبب بھی بنتے ہیں، جیسا کہ خدمتِ خلق کے اعمال۔ یہ ضروری نہیں کہ ایسے اعمال ان کے اپنے لیے بھی فائدے کا سبب ہوں۔ ابنِ رجب فرماتے ہیں،

> نیکی کا حکم دینا ایک خیر کا عمل ہے، دو کے درمیان مصالحت کرانا ایک اچھا عمل ہے، اس کے باوجود کہ یہ عمل اللہ کی خاطر نہ بھی کیا گیا ہو، اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچا اور وہ لوگوں کے لیے اچھا تھا اور اچھائی کا سبب بنا۔ لیکن اس شخص کیلئے جس نے یہ عمل کیا ،اگر اسکی نیّت اللہ کی خاطر یہ کام کرنے کی ہوتی اور وہ اللہ کی خوشنودی کا

---

[1] علی القاری، مرقات المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح (ملتان، پاکستان: مکتبہ حقّانیہ، تاریخ ندارد) جلد1، ص۔43۔

طالب ہوتا تو پھر وہ اس کے لیے بھی اچھا ہوتا اور اسے اسکی جزا بھی ملتی۔ اگر یہ اسکی نیّت نہیں تھی تو دراصل اسکے لیے اس میں کوئی اچھائی نہیں نہ ہی اسکے لیے کوئی اجر ہے۔[1]

کفّار کے اعمال، چاہے وہ کتنے ہی فائدہ مند اور خدمتِ خلق کے لیے ہی کیوں نہ ہوں ان کے ساتھ ایک مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی خاطر نہیں ہوتے۔ ان کے اعمال یا تو خود ساختہ خداؤں جیسے عیسیٰ علیہ السلام کیلیئے یا انفرادی اَنا کی تسکین کیلیئے۔ بلکہ کئی بار۔ بہت بار انکے اعمال دوسروں کو دکھانے کی غرض سے ہوتے ہیں۔ ان کے اعمال اللہ تعالیٰ کی خاطر نہیں ہوتے، لہٰذا، ان کے لیے آخرت میں کوئی جزا نہیں۔ ان کا دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ اللہ کے سامنے جھکنے سے انکار کر رہے ہوتے ہیں۔ سو، عملاً ان میں کوئی اچھائی نہیں ہوتی وہ ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں قرآن نے یوں بیان کیا،

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا۔ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا۔ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَ اتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَ رُسُلِيْ هُزُوًا۔

"اے نبی ﷺ ! ان سے کہو، کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جہد راہِ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے ربّ کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا (ملاقاتِ ربّ کا انکار کیا) اس لیے ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے، قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں

[1] ابنِ رجب، جامی، جلد 1، ص۔ 67۔

گے۔ ان کی جزا جہنم ہے اُس کفر کے بدلے جو انہوں نے کیا اور اُس مذاق کی پاداش میں جو وہ میری آیات اور میرے رسولوں کے ساتھ کرتے رہے۔" (الکہف:103-106)

یہ ممکن ہے کہ اللہ انہیں اسی دنیا میں ان کے کیے کا بدلہ دے دے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد جس کا حوالہ پہلے بھی دیا گیا ہے کہ،

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَ هُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔

"جو لوگ بس اس دنیا کی زندگی اور اس کی خوشنمائیوں کے طالب ہوتے ہیں ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ (وہاں معلوم ہو جائے گا کہ) جو کچھ انہوں نے دنیا میں بنایا وہ سب ملیامیٹ ہو گیا اور اب ان کا سارا کیا دھرا محض باطل ہے۔" (ہود:15-16)

"لہٰذا جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے تھی اسکی ہجرت اللہ اور اسکے رسول کے لیے تھی۔"

یہاں پر رسول ﷺ ایک مثال دے رہے ہیں اس اہم اُصول کی وضاحت کے لیے جو حدیث کے پہلے حصے میں بیان ہوا، یہ ایسا ہے کہ آپ ﷺ فرما رہے ہوں کہ "باقی اعمال بھی ہجرت ہی کی طرح ہیں" درحقیقت اس حدیث میں آپ ﷺ نے صرف ہجرت کی مثال دی۔ قرآن ایک بہت اچھی تمثیل پیش کرتا ہے جس میں ان دو اشخاص کا ذکر ہے جو ایک ہی عمل کرتے ہیں لیکن ان کے نتائج یکسر مختلف ہوتے ہیں، اس مثال میں اللہ کی خاطر

صدقات دینے کا معاملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ دو مختلف مقدمات ایک خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ بالآخر کتنے بے کار ہیں ایسے اعمال جو اللہ کی خوشنودی کیلئے نہیں کیے جاتے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ۔ وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔

"اے ایمان لانے والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملادو جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے، نہ آخرت پر۔ اس کے خرچ کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک چٹان تھی۔ جس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کرکے جو نیکی کماتے ہیں، اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا، اور کافروں کو سیدھی راہ دکھانا اللہ کا دستور نہیں ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضاجوئی کے لیے دل کے پورے ثبات و قرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو۔ اگر زور کی بارش ہو جائے تو دو گنا پھل لائے، اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس کے لیے کافی ہو جائے۔ تم جو کچھ کرتے ہو، سب اللہ کی نظر میں ہے۔" (البقرہ:265-264)

حدیث کے مذکورہ حصے میں رسول ﷺ نے فرمایا" لہٰذا جس کی ہجرت اللہ اور اسکے رسول کیلئے تھی اسکی ہجرت اللہ اور اسکے رسول کیلئے تھی"، اس بات پر غور کیجئے کہ عام طور پر

ایک جملے میں شرط اور اسکی جزا والے حصے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں لیکن یہاں پر یہ دونوں بالکل ایک سے ہیں۔ اس بنا پر جملے میں تکرار کی صورت بن جاتی ہے۔ اصحابِ علم نے اس جملے کے اصل مفہوم اور اسکے مضمرات پر بحث کی ہے۔

چند اصحابِ علم نے اس جملے کو سمجھنے کے لیے تقدیر کا سہارا لیا ہے اور اسے یوں سمجھا ہے ”جو کوئی اللہ کی اور اسکے رسول ﷺ کی خوشنودی کیلئے ہجرت کرتا ہے تو اس ہجرت کیلئے اسکا اجر بھی اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے پاس ہے“ یا ”جو کوئی اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی طرف ہجرت کرتا ہے، نیک نیّت اور نیک مقصد کے ساتھ، ایسی صورت میں اس پر یہ حکم صادق آئے گا کہ اسکی ہجرت اللہ اور اسکے رسول ﷺ کیلئے تھی۔“ لیکن یاد رہے کہ تقدیر کا سہارا عین ضرورت کے تحت ہی لیا جائے گا۔ (تفصیلی بحث کیلئے ضمیمہ 1 دیکھیے)

بعض علما کا بیان ہے کہ عام حالت میں معنی میں تبدیلی الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ منسلک ہوتی ہے لیکن معنی میں ردّ و بدل الفاظ کی تبدیلی کے بغیر بھی ممکن ہے، اس دوسری صورت میں سیاق و سباق کی مدد سے سمجھنا ہوگا۔ یعنی ایک ہی جیسے الفاظ میں مختلف معنی مضمر ہو سکتے ہیں اور سمجھے جا سکتے ہیں۔ یہاں ہم سیاق و سباق میں نیّت پر اعمال کا انحصار ہونے کے تعلّق سے سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے اعمال اللہ کے پاس جزا کا سبب بنیں گے۔

کچھ اور اصحابِ علم اِسے عربی کے اس جملے کے مساوی سمجھتے ہیں {ایسے جملے اردو میں بھی مستعمل ہیں} ” میں وہ ہوں جو کہ میں ہوں “ ”اور میری شاعری میری شاعری ہے“ عام طور پر اگر مُبتدا اور خبر یا شرط اور جزا ایک جیسے ہی الفاظ میں بیان ہوں تو ایسا اُسلوب مبالغے اور زورِ بیان کیلئے استعمال ہوتا ہے اس سے مقصود کسی چیز کا مرتبہ بہت بڑھانا یا اسے بہت حقیر بنانا ہوتا ہے، یہاں رسول ﷺ صاف طور پر ” اللہ اور اسکے رسول ﷺ “ کا استعمال دوبارہ اسلیے کرتے ہیں کہ اس سے مقصود ہجرت کے مقصد کی اہمیت اور اس کی عظمت کو واضح کرنا ہے۔

ابنِ رجب اسکی ایک اور تفسیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "اللہ اور اسکے رسول ﷺ" کا دوبارہ استعمال اسلیے ہے کہ اللہ اور اسکا رسول کسی انسان کے لیے اس دنیا اور آخرت کی حتمی منزل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک واحد ہدف ہے جو کسی اور کے ساتھ ملایا نہیں جا سکتا اسلیے آپ ﷺ نے یہی جملہ دہرا دیا۔ ابنِ رجب نے خالص اللہ اور اسکے رسول ﷺ کیلئے کی جانے والی ہجرت کی بھی تفسیر بیان کی ہے،

جو کوئی دارالاسلام میں ہجرت کرتا ہے اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی محبّت کی خاطر اور اس خواہش کے ساتھ کہ اسلام کو سمجھے اور اسلام پر کھلے عام عمل کر سکے جیسا کہ اسکے لیے دارالکفر میں کرنا ممکن نہ تھا، ایسے شخص کی ہجرت خالص اللہ اور اسکے رسول ﷺ کیلئے ہے۔ جو عزّت و تکریم اسے اللہ اور اسکے رسول ﷺ کیلئے ہجرت کرنے کی نیّت کی وجہ سے حاصل ہوئی وہ کافی ہے۔ اس تناظر میں وہی الفاظ دہرائے گئے ہیں۔ یہ اسلیے کہ اس نے اس دنیا اور آخرت کے آخری اور بعید ترین مقصد کو حاصل کر لیا ہے۔[1]

ابنِ رجب مزید بیان کرتے ہیں،

اللہ اور اسکے رسول ﷺ کیلئے ہجرت صرف ایک مقصد (کیلئے) ہے اس وجہ سے جملے میں وہی الفاظ دہرائے گئے ہیں۔ مگر اس دنیا کیلئے ہجرت کے کئی مقاصد ہو سکتے ہیں جن کی تعداد کا تعیّن بھی ممکن نہیں۔ ایک شخص اس دنیا کے حُصول کے سلسلے میں کسی مُباح مقصد سے بھی ہجرت کر سکتا ہے اور ایک اور موقع پر کسی حرام مقصد سے بھی ہجرت کر سکتا ہے۔ غرض دنیاوی مقاصد اتنے سارے ہو سکتے ہیں کہ

---

[1] ابنِ رجب، جامی، جلد 1، ص۔ 73۔

ان کی تعداد کا تعیّن بھی مشکل ہے۔ اس لیے رسول ﷺ نے (آگے حدیث میں) فرمایا کہ "اس کی ہجرت اُسی {چیز کی خاطر} کیلئے ہے جسکے لیے اس نے ہجرت کی" یعنی وہ چیز چاہے جو بھی ہو۔[1]

رسول ﷺ نے جو یہ بات دہرائی "اللہ کیلئے اور اسکے رسول ﷺ کے لیے" بجائے اسکے صرف یہ فرماتے "اُن کیلئے" جیسا کہ اوپر بیان ہوا، شاید یہ تعظیم کی غرض سے اور اسکی اہمیت کو اجاگر کرنے کی خاطر کیا گیا ہو یا پھر اس وجہ سے کہ اللہ اور رسول دونوں کے لیے ایک اسمِ ضمیر (Pronoun) نہ استعمال کیا جائے۔ ایک بار ایک شخص نے کہا "جو کوئی اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت کرے گا وہ ہدایت پر ہو گا اور جو اُن کی نافرمانی کرے گا وہ گمراہی پر ہو گا" رسول ﷺ نے فرمایا کہ اس نے نامناسب طریقے سے یہ بات کی اور اسے بتایا کہ اسے ایسے کہنا چاہیے تھا "جو کوئی اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے" (مسلم) یہ بات اسطرف اشارہ کرتی ہے کہ کوئی عمل یا بیان جو کسی طور پر بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو ہمسر یا شریک ٹھہرانے کی طرف اشارہ بھی کرے اس سے اجتناب کرنا چاہیے، اس وجہ سے رسول ﷺ نے یہ پسند نہیں کیا کہ آپ ﷺ کو اللہ کے ساتھ ملایا جائے، دونوں کیلئے ایک ہی اَسمِ ضمیر استعمال کیا جائے۔[2]

ہجرت کے معنی

ہجرت کے معنی ہیں "کسی چیز کو چھوڑنا یا اس سے کنارہ کش ہونا اور ایک چیز سے دوسری

---

[1] ابنِ رجب، جامی، جلد 1، ص۔ 73۔

[2] سنن ابوداؤد میں موجود ایک حدیث کے مطابق رسول ﷺ نے فرمایا" جو بھی اللہ اور اسکے رسول ﷺ۔۔۔ اور جو انکی نافرمانی کرے۔۔۔" لیکن الالبانی کے مطابق یہ حدیث کمزور ہے۔ دیکھیں محمد ناصر الدین الالبانی، ضعیف سنن ابوداؤد (بیروت: المکتب الاسلامی، 1991)، ص۔ 108۔

چیز کی طرف حرکت کرنا" اس کی سب سے نمایاں شرعی تعریف اسلام کے نفاذ اور اسلام پر عمل کی غرض سے دارالکفر کو چھوڑ کر دارالاسلام کی طرف جانا ہے۔ اس حدیث میں بھی یہی ظاہری حوالہ موجود ہے۔ رسول ﷺ کی حیاتِ طیّبہ کے دوران دو مشہور ہجرتیں ہوئیں، پہلی ہجرت مکّہ سے حبشہ کو 6 نبوی میں ہوئی۔

دوسری ہجرت جس سے مسلم جنتری کی ابتدا ہوتی ہے وہ مکّہ سے مدینہ کو ہوئی، بہت سے اصحابِ علم کے نزدیک جن میں شروع کے اصحابِ علم میں سے السّدّی اور جدید اصحابِ علم میں سے الشنقیطی شامل ہیں، یہ ہجرت ایمان رکھنے کیلیۓ شرط تھی۔ یعنی ایک شخص سچا مسلم تصوّر نہیں کیا جاتا اگر اسکے پاس ہجرت کرنے کے وسائل موجود تھے اور اسکے باوجود اس نے ہجرت نہیں کی۔[1] ابنِ عطیہ نے استبصار کیا ہے کہ زیادہ مضبوط استدلال یہ ہے کہ جس نے ہجرت نہیں کی وہ جہنم کی آگ کی سزا کا حقدار ہے۔۔۔۔[2]

اسطرح کی ہجرت فتح مکّہ کے بعد ختم ہوگئی۔ مکّہ اسلامی حکومت کا حصہ بن گیا اور اسوجہ سے اس بات کی کوئی ضرورت یا اہمیت باقی نہیں رہی کہ وہاں سے ہجرت کی جائے یہ رسول ﷺ کی اس حدیث کا مفہوم ہے جسے اکثر غلط سمجھا گیا ہے۔

لاهجرة بعد الفتح ولكن جهاد ونية۔

"فتح مکّہ کے بعد کوئی ہجرت نہیں البتہ جہاد اور نیّت باقی ہے۔"

جب کوئی نیّت کے بارے میں زیرِ مطالعہ حدیث پڑھتا ہے تو ظاہری طور پر ہجرتِ مدینہ ذہن میں آتی ہے لیکن کوئی مصدّقہ روایت اس کے متعلّق موجود نہیں کہ مذکورہ حدیث اِسی ہجرت کی طرف اشارہ کررہی ہے۔ بلکہ حدیث کے معنی اور احکام عمومی ہیں اور ہر ہجرت پر

---

[1] الشنقیطی، جلد1، ص ص۔150-144۔

[2] الشنقیطی، جلد1، ص ص۔151-150۔

منطبق ہوتے ہیں۔ مندرجہ ذیل حدیث بتاتی ہے کہ ہجرت اسوقت تک موجود رہے گی جب تک غیر مسلم ممالک اور علاقے موجود رہیں گے۔ یعنی جب تک ایسے علاقے موجود ہونگے جہاد کا سبب بھی موجود رہے گا اور اِسی طرح ان علاقوں سے نقلِ مکانی کر کے مسلم علاقوں میں آنے کا سبب بھی موجود رہے گا۔ امام احمد کی روایت ہے کہ رسول ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ہجرت ختم ہوگئی۔ رسول ﷺ نے اسے جواب دیا،

ان الهجرة لا تنقطع ماكان الجهاد۔

”ہجرت منقطع نہیں ہوگی جب تک جہاد موجود ہے۔“[1] ایک اور حدیث میں ہے کہ،

لا تنقطع الهجرة حتى تنقطع التوبہ ولا تنقطع التوبة حتى تطلع الشمس من مغربها۔

”ہجرت ختم نہیں ہوگی جب تک توبہ ختم نہیں ہوگی اور توبہ ختم نہیں ہوگی جب تک سورج مغرب سے طلوع نہیں ہوگا۔“[2]

ہجرت کا مقصد ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہونا ہے تاکہ وہاں مذہب پر بہتر یا بہترین طریقہ پر عمل کیا جاسکے۔ اسلیے اصحابِ علم نے مندرجہ ذیل اقسام کی ہجرت کا ذکر کیا ہے۔

1۔ دارالکفر سے دارالاسلام کو ہجرت۔ یہ ہجرت کی سب سے زیادہ عام فہم قسم ہے اور زیادہ تر موضوعِ بحث ہجرت کی یہی قسم ہوتی ہے۔ یہ ان مسلمانوں کے لیے جو آج کے مغربی ممالک میں رہتے ہیں ایک اہم سوال ہے۔

---

[1] اسے احمد نے اور الطحاوی نے شکل آثار میں محفوظ کیا، الالبانی کے مطابق یہ ایک مستند حدیث ہے۔ محمد ناصر الدین الالبانی، سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ (عمّان، اردن، المکتب الاسلامی، 1983) جلد4، ص۔239۔

[2] اسے ابوداؤد نے محفوظ کیا، الالبانی کے مطابق یہ صحیح حدیث ہے۔ محمد ناصر الدین الالبانی ، صحیح سنن ابوداؤد(ریاض: مکتب التربیہ العربی لدولہ الخلیج، 1989) جلد2، ص۔470۔

2۔ ایک ایسے مقام سے ہجرت کرنا جہاں بدعات عام ہوں۔ امام مالک نے ایک مرتبہ فرمایا" اس کی اجازت نہیں کہ کوئی ایسے علاقے میں مقیم رہے جہاں لوگ سلف صالحین کی ہتک کرتے ہوں۔"[1] اگر ایک انسان میں یہ طاقت نہیں کہ اسے تبدیل کرے جو وہ کر رہے ہوں تو اسے چاہیے کہ ایسی جگہ کو چھوڑ دے۔ یہ ایک ضابطہ قرآنی کے مطابق ہے:

وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ ؕ وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۔

"اور اے نبی ﷺ، جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں لگ جائیں۔ اور اگر کبھی شیطان تمہیں بھلاوے میں ڈال دے تو جس وقت تمہیں اس غلطی کا احساس ہو جائے اس کے بعد پھر ایسے ظالم لوگوں کے پاس نہ بیٹھو۔" (الا انعام:68)

{ہماری رائے میں اس آیت کا انطباق براہِ راست ہجرت پر کرنا مناسب نہیں کیونکہ آیت کے الفاظ صاف طور پر یہ بتا رہے ہیں کہ ایک ایسی جگہ سے عارضی طور پر ہٹ جانے کی ہدایت ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی آیات پر نکتہ چینیاں ہو رہی ہوں اور کہا جا رہا ہے کہ جب وہ لوگ ایسی گفتگو چھوڑ دیں تو اس جگہ پر رُکا جا سکتا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم مکمل طور پر ہجرت (ہجرت کے عام فہم معنوں میں) مراد نہیں۔ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ایسا مقام جہاں اس قسم کے واقعات کثرت سے ہوتے ہوں وہ رہنے کیلئے کوئی اچھی جگہ نہیں یا ایسے لوگوں سے میل جول بھی مناسب نہیں۔ ہاں ہجرت کی ایک دوسری تعریف جو آگے بیان کی گئی ہے جس میں الصُنابحی کے قول کے ساتھ رسول ﷺ کی یہ حدیث "مہاجر وہ

---

[1] حوالہ در حسین العوایشہ، الفصل المبین فی الصالح الجرۃ ولمفارقۃ المشرکین (عمّان، اردن: دار الاصید، 1993)، ص۔40۔

ہے جو ان چیزوں سے دور رہتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے منع فرمائیں۔" بیان کی گئی ہے، اس بات کی گنجائش ضرور پیدا کرتی ہے کہ سورۃ آلِ عمران کی اس آیت کا انطباق استعاراتی طور پر ایسی ہجرت پر کیا جاسکتا ہے۔(مترجم)}

3۔ ایسے مقام سے ہجرت کرنا جہاں حرام عام ہو اس مقام کی طرف جو اس سے بہتر ہو۔ یہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں حلال راہ کی جستجو کریں۔

ہجرت کی اور اقسام بھی ہیں جو بظاہر دنیاوی مقاصد کیلئے ہیں لیکن بالآخر یہ بھی اللہ ہی کی بندگی کی غرض سے ہونی چاہیں۔ یہ معاملہ ان مُباح اعمال کا سا ہے کہ اگر وہ صحیح نیّت کے ساتھ کیے جائیں تو اللہ ان پر جزا عطا کرے گا۔ اس قسم کی ہجرت میں مندرجہ ذیل شامل ہیں۔

4۔ ایک ایسے مقام سے ہجرت کرنا جہاں جانی نقصان کا ڈر ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی اجازت دی ہے۔ ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی کیا۔ اسے سمجھ لیں کہ اگر ایک شخص اپنے آپ کو کسی جانی نقصان سے بچانے کیلئے ہجرت کرتا ہے تاکہ وہ صحیح طریقے سے اللہ کی عبادت کرسکے تو یہ عمل خود ایک عبادت ہو گا۔

{اس کے برخلاف صورت یعنی کمزوری اور ڈر کے ماحول میں زندگی گزارتے رہنے کے حوالے سے سورۃ النساء، 97، جو آیتِ مستضعفین بھی کہلاتی ہے۔ ایک تنبیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُھَاجِرُوْا فِيْھَا ۭ فَاُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىھُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا۔

"جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے اُن کی رُوحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور اور مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا، کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ

لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔"(مترجم)}

{ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت آپ کی اپنی قوم کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کرنے کے بعد کا واقعہ ہے جبکہ موسیٰ علیہ السلام کی پہلی ہجرت جو انہوں نے ذاتی طور پر کی ان کی نبوّت سے قبل کا واقعہ ہے۔ جبکہ آخری ہجرت جو کہ پوری قومِ بنی اسرائیل کے ہمراہ کی وہ ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کی طرح دینِ اسلام کی خاطر تھی۔ لہٰذا، اس فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ کسی مقام سے جان کی امان کے لیے ہجرت دو صورتوں میں ہے: پہلی وہ جبکہ دعوت اور نفاذِ اسلام کی کوششوں کے نتیجے میں جان کا خطرہ لاحق ہو اور ہجرت کا مقصد کسی اور مقام پر پہنچ کر اس جدوجہد کو جاری رکھنا ہو اور دینِ اسلام پر قائم رہتے ہوئے اور اس پر بلاروک ٹوک عمل کرتے ہوئے زندگی گزارنا ہو، تو ایسی ہجرت اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے لیے ہوگی؛ دوسری قسم وہ ہے جبکہ ہجرت کا مقصد جان ومال کا تحفّظ ہو۔ شاید موسیٰ علیہ السلام کی پہلی ہجرت اسی قسم کی ہجرت کی ایک مثال ہے۔ تاہم، اگر اس میں دعوت ونفاذِ اسلام یا دینِ اسلام پر بلاروک ٹوک عمل کرتے ہوئے زندگی گزارنا پیشِ نظر نہ ہو تو پھر جان ومال کی حفاظت ایک دنیاوی مقصد ہی بن کر رہ جائے گی اور شاید اس پر حدیث کے دوسرے حصے کا ہی اطلاق ہوگا، "جس کی ہجرت کسی دنیاوی فائدے۔۔۔تو اس کی ہجرت اُسی کے لیے تھی جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔

ضمناً یہ بات بھی نوٹ کریں کہ موسیٰ علیہ السلام کی ایک اور ہجرت بھی ہے جو انہوں نے مدین سے مصر کی طرف واپسی کی صورت میں کی۔ گو کہ اس سفر کی ابتدا صرف اپنے وطن مصر کو واپسی کے ارادے سے ہوئی، تاہم راستے میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نبوّت عطا فرمائی اور یوں ان کی مصر کو ہجرت ایک مشن کی صورت اختیار کر گئی جو اہلیانِ مصر تک دعوتِ اسلام پہنچانے کا مشن تھا۔"(مترجم)}

5۔ ایک مقام سے بیماری کے ڈر سے یا بیمار ہونے پر ہجرت کرنا۔ یہ ان افراد کا سا معاملہ ہے جو مدینے آکر بیمار ہوگئے اور رسول ﷺ نے انہیں مدینے سے چلے جانے کی اجازت دی۔

6۔ اپنی ملکیت اور مال کے نقصان سے ڈر کر ہجرت کرنا۔ مال و ملکیت حرمتوں میں سے ہیں۔ یہ جائز سمجھا گیا ہے کہ ایک شخص ایک مقام سے اسلیے ہجرت کرے کہ اسے ڈر ہو کہ اسکا مال و ملکیت ضبط ہو جائیں گے یا اسے نقصان کا اندیشہ ہو۔ یقیناً اس سے یہ مراد نہیں کہ صرف معاشی فوائد کیلئے دارالکفر کو ہجرت کر جائیں اس سے مراد دارالاسلام کے ایک اور علاقے کو ہجرت کرنا{یا دارالکفر سے دارالسلام میں ہجرت کرنا}ہے یا پھر صبر سے اپنی جگہ پر ہی مقیم رہیں۔

ہجرت کا ایک دوسرا تصوّر

المضابغی کے مطابق اس حدیث میں لفظِ ہجرت کا اطلاق ہر قسم کی ہجرت پر ہوتا ہے جس میں طبعی اور روحانی ہجرت دونوں شامل ہیں۔ یہ ہجرت کی ایک ایسی قسم ہے جو تمام مسلمانوں پر ہمہ وقت فرض ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہجرت صرف اللہ کی خاطر ہی ہونی چاہیے اور اللہ کی خاطر ہی ہو سکتی ہے۔ رسول ﷺ نے ایک حدیث میں اسے یوں بیان فرمایا:

المهاجر من هجر مانهى الله عنه۔

”مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں سے دور رہتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے منع فرمائی ہیں۔“(البخاری)

”جس کی ہجرت دنیاوی فائدے کیلئے تھی یا کسی عورت سے نکاح کیلئے تھی۔ اس کی ہجرت اُسی کیلئے تھی جس کے لیے اس نے ہجرت کی“۔

رسول ﷺ نے ایسے مقاصد کی تفسیر فرمائی جس میں دنیا مطلوب ہو اور فرمایا” پھر اسکی ہجرت اسی کے لیے تھی“ بجائے اس کے کہ اس کا نام بھی لیا جائے۔[1] اور پھر اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے لیے ہجرت ذہن میں صرف ایک مقصد لیے ہوئے ہوتی ہے جبکہ ہجرت بیشتر دوسرے مقاصد کیلئے بھی ہوسکتی ہے لیکن ان کو بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اسلیے رسول ﷺ نے ان کا ذکر نہیں کیا۔

لفظِ دنیا کے معنی

لفظِ دنیا(دنیا کی زندگی) کے معنی ممکنہ طور پر الادنیٰ” قریب ترین“[2] سے ہیں۔ اسے یہ نام اس لیے دیا گیا کہ یہ آخرت کی زندگی کے مقابلے میں قریب ترین زندگی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہ اپنی فنا کے قریب ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ دنیا دراصل الدناعہ

---

[1] گو کہ یہ انگریزی زبان کا ایک عام اُسلوب ہے تاہم عربی میں یہ کسی کا نام لینے سے گریز کرتے ہوئے اسکی تحقیر کے لیے مستعمل ہے جیسے کہ اس مثال کا معاملہ ہے۔

[2] لہٰذا ، جو لوگ صرف دنیا کے طالب ہیں، درحقیقت ایسے لوگ کوتاہ نظر ہیں اور قریب ترین اور آسانی سے ملنے والی زندگی ہی میں محدود ہیں۔ بہر حال وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جو زندگی اہم ہے اس کیلئے انہیں محنت کرنا ہوگی جیسا کہ اس دنیا کی دوسری چیزوں کے حُصول کے لیے محنت درکار ہوتی ہے۔

سے ہے جس کے معنی ہیں حقیر، ناقابلِ ذکر، بے معنی۔[1] بہر حال پہلے بیان کیے گئے۔ دو معنی عام طور پر صحیح سمجھے جاتے ہیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلّق ہے کہ یہ لفظ کس چیز کی طرف اشارہ کرتا ہے، غالب رائے یہ ہے کہ یہ لفظ ان تمام چیزوں کا احاطہ کرتا ہے جو کرۂ ارض اور اسکے ماحول میں ہوتی ہوں، ہو رہی ہوں یا قیامت کے واقع ہونے تک ہونے والی ہوں۔

پچھلی صدی نے ایک ہجرت دیکھی جو مسلمانوں کے لیے بہت نقصان دہ تھی اور یہ دنیاوی مقاصد کیلیئے تھی۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد دارالاسلام کو چھوڑ کر مغرب کے دارالکفر میں آبسی۔ اس ہجرت کا بنیادی مقصد معاشی خوشحالی کا حُصول یا اس حدیث کے الفاظ میں دنیا تھا۔ ان میں سے کئی کا نتیجہ اسلام سے دوری کی صورت میں نکلا، کیونکہ یہ لوگ مغرب میں آکر آباد ہوئے اور اسلام کے تقریباً سارے اوصاف سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اور اگر پہلی نسل نے کچھ تھوڑا اسلام بچا بھی لیا تو ان کے بعد آنے والی نسل بالعموم اسلام سے بے بہرا ہو گئی۔ ان کے بچوں نے اسلام کو کھو کر اپنے آپ کو معاشرے کے رنگ میں رنگ لیا۔

{ہجرت کے تناظر میں ماضیُ قریب اور حالات حاضرہ پر ایک جائزے کے لیے حدیث کی تشریح کے آخر میں ضمیمہ نمبر 3 ملاحظہ فرمائیں۔(مترجم)}

معاشی تگ ودو میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہونا جبکہ اسلامی ماحول کے حِساب سے کوئی تبدیلی نہ ہو تو اسلامی قانون اس کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن اگر دنیا کیلیئے ہجرت کرنے سے اسلام سے دور ہونے کا اندیشہ ہو یا یہ کہ کسی کا اسلام خطرے میں پڑ جائے تو پھر ایسی ہجرت کی اجازت نہیں۔ بلکہ یہ تو ہجرت کے بنیادی تصوّر ہی کے منافی ہے جس میں ایک شخص ایک مقام سے دوسرے مقام پر اس مقصد سے منتقل ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے دین

[1] دیکھیں المضا بغی، ص۔33۔

کے معاملات میں بہتری پیدا کرے۔

بد قسمتی سے اس دنیا میں یہ قوّت اور کشش ہے کہ لوگ اپنی زمین، معاشرے، خاندان، رفقا اور طرزِ زندگی کو اس دنیا میں آگے بڑھنے کی خاطر پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ اور کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے حُصول میں بھی ناکام ہو جاتے ہیں۔ اگر اپنے دین کو گرا کر کچھ تھوڑا دنیاوی فائدہ حاصل بھی ہو گیا تو یہ گھاٹے کا ہی سودا ہے اس دنیا اور آخرت دونوں کے لیے۔

اگر دنیا اتنی حاوی ہو سکتی ہے کہ اس کی خاطر ایک انسان اپنے خاندان اور اپنی زمین کو چھوڑ سکتا ہے تو تصوّر کیجئے کہ اس دنیا کے حُصول کے لیے وہ کیا کیا کر گزرے گا، ایک صحیح مومن کو اپنی نگاہ آخرت پر رکھنی چاہیے۔ اسے چاہیے کہ اس دنیا کو آخرت میں اللہ کی خوشنودی اور اسکی نعمتیں حاصل کرنے کا ذریعہ بنائے۔ جب کوئی کام کرے آخرت کو ذہن میں رکھتے ہوئے کرے اور اگر وہ اس دنیا ہی کیلئے تگ و دو کرتا ہے تو اسے کچھ عارضی فائدہ ملے گا جو دیر تک رہنے والا نہیں ہو گا۔ بروزِ قیامت وہ اپنے آپ کو الزام دے گا اس بات پر کہ اس نے آخرت کے لیے کچھ نہیں کیا اور دنیا ہی میں لگا رہا۔

دنیا کے بعد عورت کا ذکر

اس حدیث میں رسول ﷺ نے کسی عورت سے نکاح کی خاطر ہجرت کرنے کا ذکر اس دنیا کے کچھ فائدے کے لیے ہجرت کرنے کے بعد کیا۔ ظاہر ہے کہ عورت سے نکاح بھی دنیا ہی کا ایک حصہ ہے۔ اس لحاظ سے رسول ﷺ کا ایک عمومی بیان کے بعد ایک مخصوص اور اہم پہلو کا ذکر کرنا۔ اس بات کی نشانی ہے کہ عورت یا صنفِ مخالف عمومی طور پر ایک انسان کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈال سکتے ہیں۔ حتٰی کہ ہجرت کی طرح کا ایک بہت بڑا اور نیک عمل بھی اللہ کی بجائے عورت کی خاطر ہو سکتا ہے۔ رسول ﷺ نے اُمّت کو دنیا کے بارے میں محتاط رہنے کی اور بالخصوص عورت کے بارے میں چوکنّا رہنے کی نصیحت کی اور ان دونوں

کا ایک ساتھ ذکر کرتے ہوئے فرمایا،

ان الدنیا حلوۃ خضرۃ وان اللّٰہ مستخلفکم فیھا فینظر کیف تعملون فاتقو الدنیاواتقو النساءفان اول فتنۃ بنی اسرائیل کانت فی النساء۔

"یقیناً دنیا بہت شیریں اور دلفریب ہے یقیناً اللہ تمھیں اس دنیا کا وارث بنائے گا تا کہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ تو ہوشیار رہنا اس دنیا سے اور مرد عورت سے، یقیناً پہلا فتنہ جو بنی اسرائیل کے قبیلوں میں پھیلا وہ عورت ہی سے متعلّق تھا"(مسلم)۔ بالخصوص عورت کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا،

ماترکت بعدی فتنۃ اضر علی الرجال من النساء۔

"میں نہیں دیکھتا اپنے بعد کوئی فتنہ جو ایک مرد کیلئے عورت سے زیادہ نقصان دہ ہو۔"(البخاری و مسلم)

یقیناً آج بھی صنفِ مخالف کا اثر یہاں تک کہ ایسے افراد پر بھی دیکھا جا سکتا ہے جو عمومی طور پر نیک ہوتے ہیں۔ بہت سی مثالیں ایسی ملیں گی جس میں ایک مرد کسی ایک خاتون سے شادی کا فیصلہ کر لیتا ہے دراصل وہ اسکی "محبّت میں مبتلا" ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ان کی بقیہ زندگی اسلام کے مطابق ہوتی ہے اور انکی نیّت بھی اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی ہوتی ہے۔ کئی بار وہ اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ ایک دوسرے سے شادی کے علاوہ کوئی راستہ نہیں سوجھتا۔ کئی بار تو نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اس بات کی بھی پروا نہیں کرتے کہ شریعت اس شادی کے بارے میں کیا کہتی ہے۔ مثلاً، اگر لڑکی کا ولی اس شادی کے لیے راضی نہ ہو پھر بھی ولی کو نظر انداز کر کے کوئی طریقہ شادی کرنے کا تلاش کر لیتے ہیں چاہے ایسا کرنے کی بڑی سے بڑی قیمت ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ یہ ایک مثال ہے اس اثر کی جو مخالف صنف ایک شخص پر ڈال سکتی ہے۔ واللہُ اعلم بالصواب۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ رسول ﷺ نے نیّت کے متعلّق اس اہم حدیث میں عورت کا ذکر خصوصاً اسی وجہ سے کیا۔

اسلام کے دشمنوں کو بھی اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ عورت کتنی پر اثر ہو سکتی ہے، پچھلی چند صدیوں سے وہ یہ کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں کہ وہ مسلم خواتین کو گھروں سے باہر لائیں تاکہ وہ اپنی جسمانی خوبصورتی کو لوگوں کے سامنے نمایاں کریں۔{آجکل ہمارے ہاں کے ذرائع ابلاغ ان ہی مقاصد کی تکمیل میں پیش پیش نظر آتے ہیں(مترجم)}اگر مسلم خواتین اسلام سے دور ہو جاتی ہیں تو پھر وہ اپنے ولی، اپنے خاوند اور دیگر کی نافرمانی کریں گی یہ ایک بہت مشکل مخاصمت ہو گی اور بہت سے مرد اپنے اندر اس صورتحال سے نمٹنے کی استطاعت نہیں پائیں گے اور مزید یہ کہ عورت اپنا اثر مسلمانوں کی اگلی نسل پر بھی چھوڑے گی۔

”اسے علمائے حدیث کے دو اماموں ابو عبد اللہ محمد ابنِ اسماعیل ابنِ ابراہیم ابنِ المغیرہ، ابنِ بردزبہ البخاری اور مسلم ابنِ الحجّاج ابنِ مسلم القشیری النیشاپوری نے اپنے مجموعہ ہائے احادیث صحیحہ میں روایت کیا جو کہ معتبر ترین مجموعہ ہائے احادیث ہیں“

امام البخاری[1]

ابو عبد اللہ محمد ابنِ اسماعیل ابنِ ابراہیم البخاری الجوفی 194 ہجری بمطابق 910 عیسوی میں شہر بخارا میں پیدا ہوئے جو کہ موجودہ ازبکستان میں واقع ہے۔ ان کے والد بھی ایک جیّد عالمِ دین تھے اور حماد ابنِ زید اور امام مالک کے شاگرد تھے۔ بد قسمتی سے والد صاحب کا انتقال ہوا تو امام البخاری بہت کم عمر تھے۔

امام البخاری کو فنِ حدیث سے بچپن ہی سے لگاؤ تھا۔ 16 سال کی عمر میں ہی انہوں نے وکیع اور عبد اللہ ابنِ مبارک کا سارا کام حفظ کر لیا تھا۔ حافظے کے معاملے میں آپ بہت مضبوط تھے، یہاں تک کہ کئی لوگوں نے بیان کیا کہ امام ایک بار کسی تحریر کو دیکھ کر اسے حفظ

---

[1] سوانح حیات سے متعلّق معلومات جو یہاں درج ہیں انہیں تقی الدین المظہری، الامام البخاری امام الحفاظ والمحدثین (دمشق: دار القلم، 1950) سے لیا گیا ہے۔

کر لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی اس خداداد صلاحیت کو اسلام اور خصوصاً رسول ﷺ کی حدیث کی خدمت میں استعمال کیا۔

سولہ(16) سال کی عمر کو پہنچے تو بخارا کو چھوڑا اور حج کیلئے مکّہ تشریف لے گئے مکّہ میں کچھ عرصے قیام کیا اور یہیں اپنی پہلی کتاب لکھی۔18سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے اپنی کتاب تاریخ الکبیر مکمل کی جو آج تک حدیث کے راویوں کے حالاتِ زندگی کے بارے میں ایک سند تصوّر کی جاتی ہے۔

امام البخاری کے کئی اساتذہ ہیں اور انہوں نے 1080 اہلِ علم سے احادیث روایت کیں جن میں، امام الترمذی، النسائی، مسلم ابنِ الحجّاج اور ابنِ خُزیمہ بھی شامل ہیں۔ وہ اپنی صحیح کی وساطت سے زیادہ مشہور ہیں لیکن انہوں نے اس کے علاوہ بھی کئی کتابیں تحریر کیں جن میں اخلاق و تہذیب پر الآداب المضرد کے نام سے ایک کتاب شامل ہے۔[1]

امام مسلم[2]

مسلم ابنِ الحجّاج 202یا زیادہ امکان ہے کہ 206ہجری میں شہر نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ نیشاپور اصحابِ علم کا شہر ہونے کی حیثیت سے مشہور تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد بھی ایک صاحبِ علم شخصیت تھے۔[3] الضحبی کے مطابق امام مسلم نے حدیث کے علم کے حُصول کا آغاز 218ہجری سے کیا جبکہ ان کی عمر صرف 12سال تھی۔ آپ ایک صاحبِ

---

[1] اس کا صحیح انگریزی ترجمہ محمد محسن خان نے کیا، ترجمہ صحیح البخاری (بیروت: دار العربیہ، 1985)، الآدب المضرد کا انگریزی ترجمہ محمد البخاری، Imam Bukhari's Book of Muslim Morals and Manners الیگزینڈریا، ورجینا: الصداوی پبلیکیشنز، 1997)۔

[2] سوانح حیات سے متعلّق معلومات لی گئیں محمد فخوری، الامام مسلم ابنِ الحجاج (قاہرہ: دارالسلام، 1985)۔

[3] فخوری، ص۔36۔

حیثیت انسان تھے اس وجہ سے انہیں اپنے علم کے حُصول کی جستجو میں آسانی ہوئی۔

حدیث کے دوسرے علما کی طرح امام مسلم نے بھی علم کے حُصول کیلئے سفر کیا۔ علم کی جستجو میں آپ نے کئی اسفار کیے جن میں عراق، حجاز، بلاد الشام اور مصر کے اسفار شامل ہیں۔ خوارزم میں امام نے قطیبہ ابنِ سعید، یحیٰ النیشاپوری کے علاوہ دیگر اصحابِ علم کی شاگردی اختیار کی۔ رے میں محمد ابنِ مہران، الجمال اور دیگر اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، عراق (بشمول بغداد، کوفہ اور بصرہ) میں امام احمد ابنِ حنبل، خلف ابنِ حشام، البازار، عمر ابنِ حفص ابنِ الغیاث اور دیگر اصحابِ علم سے احادیث سنیں، شام میں آپ کی ملاقات ولید ابنِ مسلم سے ہوئی۔ دیگر اصحابِ علم جن سے امام کی ملاقات ہوئی ان میں سعید ابنِ منصور، اسماعیل ابنِ ابو اویس، عیسیٰ ابنِ حماد، ابو بکر اور عثمان ابنِ ابو شیبہ شامل ہیں۔ امام مسلم کے شاگردوں میں محمد ابنِ مخلد الترمزی، احمد ابنِ سلامہ اور ابو امر المستملی کے علاوہ بہت سے اصحابِ علم شامل ہیں۔

امام اپنے زمانے میں بہت معزّز رہے، بہت سوں کی نظر میں آپ سے بہتر صحیح اور کمزور حدیث کی پہچان کسی اور کو نہ تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کے دور میں حدیث کے چار عظیم علما موجود تھے جن میں ابوزارا، الدارمی، امام البخاری اور خود امام مسلم شامل ہیں۔

امام البخاری کے ساتھ آپ کا بہت قریبی اور اچھا تعلّق تھا، امام البخاری سے 250 ہجری میں، شہر نیشاپور میں آپ کی پہلی ملاقات ثابت ہے جبکہ امام البخاری تحصیلِ علم کے سلسلے میں وہاں تشریف لے گئے، یہ بھی ممکن ہے کہ ان دونوں کے درمیان اس سے قبل امام مسلم کے کسی سفر کے دوران ملاقاتیں ہوئی ہوں۔ امام البخاری کے قیامِ نیشاپور کے دوران آپ ان کے ساتھ مقیم رہے۔ جب الظُھلی کا امام البخاری سے مسلک کے مسئلے پر اختلاف ہوا تو الظُھلی نے کہا کہ جو کوئی البخاری کو سننا چاہتا ہے وہ میری مجلس سے اٹھ جائے۔ امام مسلم

تمام مجمع کے سامنے اُٹھ کر چلے گئے اور بعد ازاں الظُھلی کی وہ کتابیں جو امام نے ان سے حاصل کی تھیں واپس بجھوا دیں۔

امام مسلم زندگی بھر علم کے حُصول اور احادیث کی تلاش میں سفر کرتے رہے۔ اپنی وفات سے صرف دو سال قبل بھی آپ نے بغداد کا سفر کیا۔ امام مسلم کا انتقال 28 رجب 261ہجری میں شہر نیشاپور میں ہوا۔ آپ نے بہت سی کتابیں مرتّب کیں لیکن وجہ شہرت ان کی صحیح ہے۔[1]

صحیح البخاری اور صحیح مسلم

امام البخاری کی صحیح کا مکمل نام الجامع الصحیح المستند المختصر من امورِ رسول ﷺ و سُنّۃ وایّامہ ہے۔ یہ نام خود اس کتاب کے بارے میں بہت کچھ بتاتا ہے، الجامع بتاتا ہے کہ یہ کتاب ان تمام عنوانات کا احاطہ کرتی ہے جو کہ مذہب سے متعلّق ہیں جن میں عقیدہ، اعمال، عبادات، کاروبار، سیرتِ رسول ﷺ اور دیگر عنوانات شامل ہیں۔ الصحیح کے معنی ہیں کہ اس میں کوئی کمزور خبر شامل نہیں جیسا کہ امام فرماتے ہیں " میں نے الجامع میں کوئی ایسی چیز نہیں شامل کی جو کہ مستند نہ ہو" المستند واضح کرتا ہے کہ تمام مستند اخبار کا سلسلہ براہِ راست رسول ﷺ تک پہنچتا ہے۔ المختصر کے معنی ہیں کہ یہ صحیح احادیث کا ایک اختصار یا تلخیص اور لُبِّ لُباب ہے{احادیث کی تعداد کے اعتبار سے}۔

وہ دوسرے شخص جنہوں نے صحیح احادیث کا مجموعہ مرتّب کیا وہ امام البخاری کے شاگرد امام مسلم ابنِ الحجّاج القشیری النیشاپوری ہی تھے۔ ان کے مجموعۂ حدیث کو عام طور پر صحیح مسلم کہا جاتا ہے اور اسے اپنے استاد کی صحیح کے برابر مقام دیا جاتا ہے۔ اپنی صحیح کے مرتّب کرنے

---

[1] یہ کام انگریزی زبان میں ہے، عبدالحمید صدیقی، ترجمہ صحیح مسلم (بیروت: دارالعربیہ، تاریخ ندارد)۔

میں آپ نے دو لاکھ (200,000) احادیث پر تحقیق کی اور اپنی صحیح کیلئے صرف چار ہزار (4000) احادیث کو منتخب کیا۔ ایسی احادیث جو البخاری اور مسلم دونوں صحیحین میں موجود ہیں بہت زیادہ وزن رکھتی ہیں اور انہیں متّفق علیہ (جس پر البخاری اور مسلم دونوں کا اتفاق ہو) کہاجاتا ہے۔ یعنی البخاری اور مسلم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ صحیح احادیث ہیں۔ بالعموم یہ تصوّر کیا جاسکتا ہے کہ ایسی احادیث اُمّتِ مسلمہ میں درست تسلیم کی جاتی ہیں کیونکہ علمائے حدیث کا ایسی احادیث کی عمومی صداقت پر اتفاق ہے جو کہ صحیح البخاری اور صحیح مسلم میں موجود ہیں۔ یہ حدیث "اعمال کا دارومدار نیّتوں پر ہے" ایک ایسی حدیث ہے جس پر امام البخاری اور امام مسلم کا اتفاق ہے۔

عام طور پر صحیح البخاری اور صحیح مسلم مندرجہ ذیل وجوہ کی بنیاد پر ممتاز مقام رکھتی ہیں:

(1) عام طور پر ان میں بہت اعلیٰ درجہ کی مستند احادیث موجود ہیں۔

(2) عام طور پر روایت کے سلسلے مستند ہیں۔

(3) یہ صحیح احادیث کے سب سے پہلے مُرتّب کیے گئے دو مجموعے ہیں۔

(4) اُمّت مجموعی طور پر ان دونوں مجموعہ ہائے احادیث کو مستند قرار دیتی ہے اور ان کے صحیح ہونے کی تصدیق کرتی ہے۔

(5) جن دو اماموں نے یہ مجموعے مرتّب کیے فنِ حدیث کے عظیم ترین علما تسلیم کیے جاتے ہیں۔ [1]

---

[1] ان دو کتابوں کے مقام کو سمجھنے کیلئے دیکھیں، خلیل، ملاخاطر مقامات الصحیحین (1402 ہجری)۔

اس حدیث سے متعلّق چند دیگر نکات

- اللہ دلوں کا حال جانتا ہے، اس کے باوجود کہ انسان اپنے دل کی کیفیات کو دوسرے انسانوں سے پوشیدہ رکھ سکتا ہے یہ اعمال کا حصہ ہیں اور روزِ قیامت اللہ کے حضور پیش ہونگی۔
- نکتۂ اوّل کی روشنی میں اس دنیا میں اعمال کا دارومدار اپنے ظاہری پہلو پر ہی ہوگا۔ کیونکہ کوئی انسان دل کا حال نہیں جانتا لوگوں کے اعمال ان کی ظاہری شکل میں ہی لیے جائینگے۔ اسلیے اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں تو اسکی اس بات کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اور اس کا فیصلہ اللہ ہی پر چھوڑنا ہوگا۔ الّا یہ کہ وہ شخص کھلے طور پر ایسا عقیدہ رکھے یا ایسے اعمال کرے جو اس کے اقرارِ اسلام کے خلاف ہوں۔ روزِ قیامت بہر حال جانچ کا معیار مختلف ہوگا اور کوئی اللہ کو دھوکا نہیں دے سکے گا۔
- ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنے ہر عمل کے بارے میں جسے وہ کرتا ہے اچھی طرح سوچ سمجھ کر کرنے کی کوشش کرے۔ وہ بس عادتوں کا پابند ہی بن کر نہ رہ جائے، جو ایک عمل محض عادت کے طور پر کرتا ہو اور اسکے کرنے سے پہلے سوچتا نہ ہو۔ اسے واضح طور پر یہ بات سوچ لینی چاہیے کہ وہ کیا عمل کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ اسطرح اسکی پوری زندگی اللہ کی عبادت بن جائے گی۔ کیونکہ ہر عمل سے قبل وہ اس بات پر اطمینان کرلیگا کہ یہ عمل جائز اور صحیح ہے اور یہ بھی کہ اس عمل کو کرنے کی تحریک بھی درست ہے۔
- ایک عمل کے دو حصے ہوتے ہیں؛ بذاتِ خود عمل اور اسکے کرنے کی تحریک یا نیّت جو اس عمل کی پشت پر ہوتی ہے۔ دونوں کا درست اور مناسب ہونا ضروری ہے۔ یہ کافی

نہیں کہ کسی عمل کی تحریک نیک نیّتی پر مبنی ہو لیکن عمل شرعی نقطۂ نگاہ سے درست نہ ہو اس نکتے پر شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

> ایسا سوچنا درست نہیں کہ ایک غلط عمل اگر اچھی نیّت کے ساتھ کیا جائے تو وہ اللہ سے اجر کا باعث بنے گا۔ جیسا کہ ایک شخص چوری کرے اس نیّت سے کہ چوری کا مال غریبوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کردے گا اور اس سے اسے نیکی ملے گی۔۔۔۔
>
> بد اعمال وہ ہیں جو اپنے طور پر بُرے ہیں اور اللہ اور سول ﷺ نے انہیں قابلِ ملامت قرار دیا ہے۔ ایسے اعمال قابلِ نفرت ہیں اور غذابِ الٰہی کا باعث بنیں گے۔ ان اعمال کا بد ہونا ان کے محرّک کی اچھائی سے ختم نہیں ہوگا۔ کُجا یہ کہ یہ امید کی جائے کہ اس سے اللہ کا اجر نصیب ہوگا۔ یہ تو ایک بد قسمتی ہوگی اور شاید اس سے سزا میں اور اضافہ ہو کیونکہ ایسا کرنا [ایسا آیا ہے کہ] اللہ کے عقیدے کے ساتھ کھیلنا ہوگا۔[1]

- اپنی معارکتہ آراء تصنیف الموفقات فی الاصول الشرعیۃ میں الشاطبی نے نیّت، مقصد اور مطمحِ نظر کے کئی پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ اپنی بحث کے ایک حصہ میں وہ اعمال کو چار اقسام میں رکھتے ہیں پہلی دو اقسام واضح ہیں اور ان کے سمجھنے میں کوئی مسئلہ نہیں۔ **پہلی قسم** کے اعمال وہ ہیں جن میں عمل اور نیّت دونوں شریعت کے مطابق ہیں ایسے اعمال کے بارے میں کوئی سوال نہیں کہ یہ درست اور مناسب نہیں۔ **دوسری قسم** کے اعمال وہ ہیں کہ جو اعمال بذاتِ خود اور ان کی پشت پر موجود نیّت دونوں شریعت کے خلاف

---

[1] نعمانی، جلد 1، ص۔ 46۔

ہیں۔ اسکی ایک مثال یہ ہے کہ ایک شخص قصداً فرض نماز نہیں پڑھتا ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ اسکا یہ عمل غلط ہے اور اسے اپنے اس طرزِ عمل پر جوابدہ ہونا پڑے گا۔

تیسری قسم ایسے اعمال کی ہے جن میں عمل تو شریعت کے مطابق ہوتا ہے مگر نیّت شریعت سے متصادم ہوتی ہے۔ اس طرح کے اعمال کو مزید دو ذیلی اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ **پہلی ذیلی قسم** وہ ہوگی جس میں عمل کرنے والے کو یہ علم نہیں کہ عملِ شریعت کے مطابق ہے۔ اسکی ایک مثال یہ ہوگی کہ ایک شخص کوئی مشروب پیتا ہے یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ شراب ہے اور دراصل وہ شراب نہیں ہے۔ بہرحال ایسا کرنے والا گناہ گار ہوگا اپنی نیّت کے سبب جو احکامِ شریعت کو توڑنے کی تھی۔ لیکن وہ نقصان جو شراب پینے کے سبب ہوتا وہ نہیں ہوا، یعنی اس نے احکامِ شریعت کی خلاف ورزی کی نیّت کے باوجود یہ خلاف ورزی نہیں کی۔ یہ ایک طرح کا امتزاج ہے جہاں شریعت کو توڑنے کی کوشش کی گئی لیکن جو عمل کیا گیا وہ شریعت کے حِساب سے جائز تھا۔ اس دنیا کے قانون کے مطابق ایسے شخص نے کوئی بات خلافِ قانون نہیں کی اسلیے اسکو کوئی سزا نہیں دی جائیگی۔ ہاں آخرت کا معاملہ مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے وہ شخص اپنی نیّت کی بنا پر اور اس اقدام کی کوشش کی بنا پر جو اس نے کیے جوابدہ ہوگا، اسکے باوجود کہ وہ عمل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ کیا یہ گناہ اس کے برابر ہے جس میں حقیقتاً ایک شخص شریعت کے خلاف اپنے عمل میں کامیاب بھی ہوگیا؟ اس نکتے پر الشاطبی لکھتے ہیں "یہ ایک مختلف سوال ہے اور اسے یہاں زیرِ بحث لانے کی ضرورت نہیں۔"

دوسری ذیلی قسم کے اعمال وہ ہیں جن میں ایک شخص کو یہ علم ہے کہ عمل شریعت کے مطابق ہے لیکن اسکی نیّت شریعت کے خلاف جانے کی ہے۔ مثال کے طور پر، ایک

شخص نمازِ باجماعت کا اہتمام اسلیے کرتا ہے کہ لوگ اُسے دیکھیں اور اُسے ایک نیک انسان تصوّر کریں، تو وہ ایک ایسا عمل کررہا ہے جو شریعت کے مطابق ہے لیکن اسکے لیے جو نیّت ہے وہ شریعت کے برخلاف ہے۔ الشاطبی کہتے ہیں کہ ایسے اعمال اس سے پہلے بیان کی گئی اعمال کی ذیلی قسم سے زیادہ قبیح نوعیّت کے ہیں۔ ان میں ایک شخص شریعت کو اپنے مذموم ارادوں کے لیے استعمال کررہا ہے۔ ایسے اعمال میں منافقت، ریا اور وہ اعمال شامل ہیں جن میں ایک شخص شریعت کے احکام پر عمل نہیں کرنا چاہتا بلکہ متبادل راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔ ایسا شخص یقیناً گناہگار ہے اور اسکے اعمال اللہ کے ہاں مقبول نہیں۔

چوتھی قسم ایسے اعمال کی ہے جس میں ایک شخص کا عمل شریعت سے متصادم ہے لیکن اسکی نیّت شریعت کے مطابق ہے، اس چوتھی قسم کو بھی دو ذیلی اقسام میں تقسیم کرنا ہوگا۔ **پہلی ذیلی قسم** وہ ہے جس میں ایک شخص کو یہ علم ہے کہ اسکا عمل شریعت کے مطابق نہیں یہ بدعت کا ماخذ ہے۔ یہ ایسا ہے کہ عبادت کا کوئی نیا طریقہ ایجاد کرنا جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ اس کے باوجود کہ اس عمل کا مقصد اللہ کی عبادت کرنا ہی کیوں نہ ہو جو اپنے تیئں ایک اچھا مقصد ہے۔ اس قسم کے اعمال الشاطبی کے مطابق یقیناً اور غیر مشروط طور پر قابلِ ملامت ہونگے۔

چوتھی قسم کی **دوسری ذیلی قسم** اور زیادہ عجیب ہے۔ یہ ایسے اعمال ہیں جن میں عمل کرنے والے کو اس بات کا اِدراک نہیں ہوتا کہ یہ عمل خلافِ شریعت ہے۔ جبکہ اسکی نیّت شریعت کے مطابق عمل کی ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال یوں ہوسکتی ہے کہ ایک شخص کوئی مشروب انگور کارس سمجھ کر پی رہا ہے لیکن دراصل وہ شراب ہے۔

یہاں پر دو متضاد عناصر موجود ہیں، پہلا یہ کہ نیّت درست ہے، دوسرا یہ کہ عمل شریعت کے مطابق نہیں اور ایک لحاظ سے یہ پورے عمل کو غلط کر دیتا ہے۔ کسی عمل کے درست ہونے کے لیے اس کے دونوں اجزا کا درست ہونا ضروری ہے۔ شریعت کے کسی ثبوت کے بغیر ان دونوں اجزا میں سے کسی ایک کو فوقیت نہیں دی جاسکتی، تو پھر ایسی صورتوں میں جہاں ان دونوں اجزا یعنی نیّت اور اصل عمل میں اختلاف ہے، کیا فیصلہ کیا جائے گا؟ دو احادیث بالکل اسی مسئلہ کے بارے میں موجود ہیں: "یقیناً اعمال کا انحصار نیّتوں پر ہے" اور "جو کوئی ایسا عمل کرے جو ہمارے معاملات کے مطابق نہیں ایسا عمل مسترد کر دیا جائے گا"[1] اس معاملے میں علما کے دو اختلافی رائے رکھنے والے گروہ ہیں، ان میں سے ہر ایک مسئلہ کے ایک پہلو پر زیادہ زور دیتا ہے۔ جو لوگ نیّت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ایسے عمل سے کوئی نقصان نہیں ہوا اور عمل صحیح مانا جائیگا۔ جبکہ وہ جو کہ عمل کے بذاتِ خود شریعت کے مطابق ہونے کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں کہتے ہیں کہ ایسا عمل کسی صورت میں درست نہیں۔ اس میں بہترین طریقہ یہ ہو گا کہ عمل کے دونوں اجزا یعنی مسئلے کے دونوں پہلو سامنے رکھے جائیں، اگر ایک شخص بے علمی میں شراب پی لیتا ہے تو اس کیلئے کوئی سزا نہیں ہو گی کیونکہ یہ واضح ہے کہ ایسا کرنے کی اس نے نیّت نہیں کی تھی۔ مالکی نقطۂ نظر اور ان سے پہلے بہت سے اصحابِ رسول ﷺ کا نقطۂ نظر بھی یہی تھا کہ لاعلمی بھول جانے کی طرح سمجھی جائیگی۔

اس کی ایک مثال کسی لڑکا لڑکی کا، لڑکی کے ولی کی اجازت کے بغیر شادی کر لینا ہے۔ اگر انہوں نے ایسا اس لاعلمی میں کیا کہ اس اجازت کی کوئی ضرورت نہیں اور ان کی نیّت

---

[1] مسلم نے اسے محفوظ کیا، اس مجموعے کی حدیث نمبر 5۔

شریعت کے مطابق عمل کرتے ہوئے شادی کرنے کی تھی۔ ایسی صورت میں نکاح ساقط ہو جائے گا لیکن ان دونوں پر کوئی حد نہیں لگے گی اور انکی اولاد بھی جائز تصوّر ہو گی۔ انہیں صرف عقدِ نکاح کا وہ حصہ پورا کرنا ہو گا جو رہ گیا، یعنی انہیں دوبارہ لڑکی کے ولی کی اجازت سے نکاح کرنا ہو گا۔ [1]

{احناف کے ہاں اس معاملے میں کچھ مستثنیات ہیں جہاں ولی کی اجازت لازمی نہیں جیسا کہ بیوہ یا مطلقہ کو اپنا نکاح خود کرنے کی اجازت ہے۔(مترجم)}

حدیث کا خلاصہ

- ہر ذی عقل کا آزادی سے کیا ہوا عمل اپنے ساتھ نیّت کا عنصر رکھتا ہے جو کہ اس عمل کے ظہور پذیر ہونے کیلئے محرّک ہوتا ہے۔
- انسان کو وہی ملے گا جسکی اس نے نیّت کی۔ اگر نیّت اچھائی کی تھی تو اچھائی ملے گی اگر نیّت بُرائی کی تھی تو بُرائی ہی اسکا صلہ ہے۔ یعنی اسکا انجام بُرا ہی نکلے گا۔
- اگر ایک انسان خالص اللہ کی خاطر کوئی عمل کرے تو اس عمل کا اصل مقصد حاصل ہو گیا اور یہ عمل اللہ کے ہاں مقبول ہو گا۔
- ہجرت جیسے اعلیٰ درجے کے اعمال جو اللہ کی خاطر ہوتے ہیں ان میں بھی کم درجے کی نیّت موجود ہو سکتی ہے اور ایسی صورت میں جزا وہی ہو گی جسکی نیّت کی گئی۔
- یہ دنیا اور بالخصوص صنفِ مخالف کی وجہ سے انسان سے بہت سے اعمال سرزد ہوتے ہیں، یہ انسان پر گہرا اثر ڈالتے ہیں یہاں تک کہ ایک بہت پاکیزہ عمل جو کہ اللہ کی خاطر ہونا چاہیے انسان ان کی خاطر کر گزرتا ہے۔

---

[1] دیکھیں ابراہیم الشاطبی، الموافقات فی اُصول الشریعہ (بیروت: دارالمرفع، تاریخ ندارد) جلد2، ص ص۔347-337۔

ضمیمہ نمبر 1

کیا اس جملے سے کچھ حذف کیا گیا ہے "اعمال نیّتوں سے ہیں"

اصحابِ علم نے اس امر میں اختلاف کیا ہے کہ آیا رسول ﷺ کے اس قول میں کہ " اعمال نیّتوں سے ہیں" آیا اضمار یا تقدر کا معاملہ ہے یا نہیں۔ مزید یہ کہ اس جملے سے کچھ حذف ہے تو اس کی جگہ کیا تصوّر کیا جائے گا۔

جو اصحابِ علم اس خیال کے حامی ہیں کہ جملے سے کچھ الفاظ محذوف ہیں ان کا ایک استدلال یہ ہے کہ حرفِ ربط یا حرف جار اور اس لفظ کے درمیان جسے یہ پابند کرتا ہے کچھ محذوف ہے۔{ اردو زبان میں اگر یوں کہا جائے "گاڑی گیراج میں" تو یہ ایک فقرہ یا ذیلی جملہ تو ہو سکتا ہے لیکن مکمل یا درست جملہ ہونے کیلئے اس میں مزید کسی لفظ یا الفاظ کو شامل کرنا ہو گا۔ رسول ﷺ کے اس قول کے متعلّق کئی لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس قول کی نوعیّت اس قسم کے اردو زبان کے فقرے کی طرح ہے۔[1] (مترجم)}

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ حدیث حذف شدہ الفاظ کے تصوّر کے بغیر درست ہی نہیں ہو گی۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ ایسے کئی اعمال سرزد ہوتے رہتے ہیں جن کے پیچھے کوئی نیّت نہیں ہوتی۔ جیسے بالجبر کیے گئے یا غیر ارادی طور پر سرزد ہونے والے اعمال۔ لیکن تقدیر کا استعمال کیے بغیر اس حدیث کے مطابق کوئی عمل نیّت کے بغیر نہیں۔ لہٰذا، غلطی سے سرزد ہونے والے اعمال یا اس قبیل کے اور اعمال کا معاملہ پیشِ نظر رکھنے پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ

---

[1] یہ درست ہے کہ انگریزی میں اسے قواعد (گرامر) کا نقص تصوّر کیا جائیگا، عربی میں صرف یہ سمجھا جائیگا کہ اس میں کسی مفقود لفظ کی جگہ کچھ اور تصوّر کرنے کی ضرورت ہے۔

کسی اضافی لفظ یا الفاظ کے تصوّر کیے بغیر یہ جملہ درست اور مکمل نہیں ہو گا۔[1]

اس کے بعد یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا چیز تصوّر کی جائے جو اس قول کو مکمل اور درست بنادے؟ ابنِ حجر اور المبارکپوری نے اس سلسلے میں ایسے فقروں کی ایک جامع فہرست تجویز کی ہے جن میں 'عمل کی تکمیل'، 'عمل کی درستگی'، 'عمل کی قبولیت'، 'عمل کا جامع ہونا' اور ایسے کئی فقرے شامل ہیں۔[2]

دوسرے لفظوں میں مندرجہ ذیل صورتیں جملے کو مکمل کرنے کے حل کے طور پر پیش کی گئی ہیں:

'کسی عمل کا صحیح ہونا نیّت پر منحصر ہے'، 'بغیر نیّت کے عمل درست نہیں' یہاں پر استدلال یہ ہے کہ یہ حدیث ایسے اعمال کو مسترد کرتی ہے جن کی پشت پر نیّت موجود نہ ہو۔ لہٰذا، اندازاً قریب ترین معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ کوئی اعمال بغیر نیّت کے پورے نہیں ہو سکتے، یہ اس اُصول پر پابندی کے مطابق ہے کہ جس کے تحت تقدیر کی صورت میں لفظی متن کے قریب ترین الفاظ تصوّر کیے جائیں گے۔

'اعمال کی تکمیل نیّت سے مشروط ہے'، 'کسی عمل کی تکمیل نیّت کے بغیر ممکن نہیں ہے'۔ یہ احناف کی رائے سے قریب تر ہے۔ استدلال یہ ہے کہ ہر عمل کے صحیح تسلیم کیے جانے کیلئے نیّت ضروری نہیں۔ مثلاً، قرض کی ادائیگی کیلئے کسی نیّت کی ضرورت نہیں، اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو اس سے لیا ہوا قرض واپس کرتا ہے تو اسکی ذمہ داری پوری ہو گئی۔ اس کے باوجود کہ دل میں اس کام کے کرنے کی نیّت موجود نہیں تھی۔ اسی طرح سے گندگی کو صاف کرنا اچھا اور مناسب عمل ہے اس کے باوجود کہ یہ عمل بغیر کسی نیّت کے کیا گیا

---

[1] جیسا کہ المضابغی، ص ص۔ 50-41۔

[2] محمد المبارکپوری، تحفۃ الاحوذی بشرح جامع الترمذی (بیروت: دارالفکر، تاریخ ندارد)، جلد 5، ص۔ 283۔

ہو۔ علاوہ ازیں، یہ مختصر ترین اضافہ ہے جو اس جملے کو قابلِ فہم بنانے کیلئے کافی ہے۔

"اعمال کی جزا اور انکا دارومدار نیّتوں پر ہے" احناف میں یہ رائے بھی پائی جاتی ہے۔ اور وہ استدلال کرتے ہیں کہ اگر نیّت موجود نہیں تو ایسے عمل کی جزا بھی نہیں۔ یہ خصوصاً ان اعمال کے لیے درست ہے جن کیلئے احناف کے نزدیک نیّت ضروری نہیں۔ مثلاً، ان کے نزدیک وضو کیلئے نیّت ضروری نہیں۔ اگر کوئی شخص نیّت کے ساتھ وضو کرے تو اسے اس عمل کا ثواب ملے گا لیکن بغیر نیّت بھی اس کا وضو ہو جائے گا اور وہ نماز ادا کرنے کیلئے کافی ہو گا۔

جن کا خیال یہ ہے کہ، اس جملے میں تقدیر کا کوئی عمل دخل نہیں، کہتے ہیں کہ تقدیر صرف انتہائی صورت میں لاگو ہوتی ہے۔ اگر اس کی خاطر خواہ ضرورت نہیں تو اس کا استعمال درست نہیں ہو گا اور اس حدیث کے سلسلے میں ان کا یہی خیال ہے کہ یہاں تقدیر کی ضرورت نہیں۔ یہ عمر الاشقر کی رائے ہے بہر حال انہیں مجبور کیا گیا کہ اس فقرے کو من و عن لفظی حیثیت میں نہ لیا جائے۔ عمر الاشقر نے لکھا "مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ حدیث تقدیر کی متقاضی نہیں۔ یہ اس لیے کہ اعمال سے مراد یہاں اعمالِ شریعہ (جائز اور درست اعمال) ہیں کیونکہ رسول ﷺ کو شریعت سمجھانے کیلئے بھیجا گیا ہے، یہ حدیث بتاتی ہے کہ اعمالِ شریعہ نیّت کے ساتھ ہی کیے جاتے اور ہوتے ہیں۔ اگر اعمالِ شریعہ میں نیّت شامل نہیں تو ایسے اعمال اعمالِ شریعہ نہیں ہیں۔۔۔"[1] یہ وہ شرعی نقطۂ نظر ہے کہ جس کے مطابق اگر درست نیّت موجود نہیں تھی تو ایسا عمل ہوا ہی نہیں۔ واضح طور پر حقیقت یہ ہے کہ اعمال اپنی طبعی حیثیت میں ہو جاتے ہیں لیکن ان کا لازمی جز یا ستون موجود نہیں ہوتا اور یوں شرعی نقطۂ نگاہ سے یہ عمل ہوتا ہی نہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر عمل کیلئے نیّت کا ہونا ضروری

---

[1] الاشقر، مقاصد، ص۔64۔

ہے الّا یہ کہ اس سے استثنا کے لیے کوئی دلیل موجود ہو۔[1]

اوپر بیان کیے گئے تمام دلائل کا ذکر کرنے کے بعد ابنِ تیمیہ بہر حال اسے تقدیر کا معاملہ ہی سمجھتے ہیں اور یوں رقمطراز ہیں،

> جمہور کی رائے کے مطابق اس حدیث کو اس کی ظاہری شکل اور عام فہم معنوں میں لینا چاہیے، نیّت سے مراد صرف اچھے اعمال کی نیّت نہیں۔ اس کے برعکس اس کا تعلّق نیک اور بد دونوں طرح کی نیّت اور نیک وبد دونوں طرح کے اعمال سے ہے۔ اس وجہ سے ہی (رسول ﷺ نے) اسے مکمل کرتے ہوئے فرمایا" جب ہجرت اللہ اوراس کے رسول کیلئے ہو۔۔۔" آپ نے ہجرت کے متعلّق نیک نیّت کا ذکر کیا جو اللہ اور اس کے رسول کیلئے ہو جبکہ حقیر یابُری نیّت عورت کیلئے یامال ومتاع کیلئے قرار دی، اس وجہ سے آپ نے کسی اشارے کے بغیر ایک عمومی جملے کے بعد یہ تفصیل بیان فرمائی، آپ نے یہ فرمایا" تمام اعمال کا دارومدار نیّتوں پر ہے ہر ایک کیلئے وہ ہی کچھ ہے جس کی اس نے نیّت کی" اس کے بعد اپنے بیان سے اس کی تشریح کی اور فرمایا"جس کی ہجرت۔۔۔۔"[2]

واللہُ اعلم بالصواب، لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ قرآن وسنّت کو سمجھنے کا بہترین راستہ یہ ہے کہ جس قدر ممکن ہو تحریر کے قریب تر رہا جائے دراں حالِ کہ کوئی مضبوط دلیل ایسا نہ کرنے کیلئے موجود ہو۔ زیرِ نظر حدیث کے بارے میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ لفظ" اعمال" کو جان بوجھ کر، ارادی طور پر کیے گئے اعمال کے پیرائے میں دیکھنا چاہیے۔ مستثنیات میں مکمل غیر ارادی طور پر یا بالجبر کیے گئے اعمال ہی ہوں گے۔ اور اس صورت میں کسی اضافی تقدیر

---

[1] الاشقر، مقاصد، ص۔65۔

[2] ابنِ تیمیہ، شرح، ص۔16۔

کے تصوّر کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ہر بلا جبر کیا گیا عمل نیّت کے ساتھ ہو گا جیسا کہ نیّت کی تعریف سے واضح ہے۔

واللہُ اعلم بالصواب، یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس جملے کا بہترین ترجمہ یہ ہو گا کہ دانستہ طور پر کیے گئے ہر عمل کی وجہ نیّت ہوتی ہے جو وہ قوّتِ عمل فراہم کرتی ہے کہ جس کے نتیجے میں عمل وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اور یہ نیّت قابلِ ستائش یا قابلِ گرفت ہو سکتی ہے۔ ابنِ رجب اس نقطہ ٔ نظر سے اتفاق کرتے ہیں اور اپنی تفسیرِ حدیث میں یوں رقمطراز ہیں،

> 'اعمال کا دارومدار نیّتوں پر ہے' میں تقدیر کے مسئلے پر اختلافِ رائے پایا جاتا ہے، علمائے متاخّرین میں یہ رائے پائی جاتی ہے کہ یہاں تقدیرِ کلام لاگو ہو گا جیسے 'صحیح' 'قابل توجہ' 'مقبول' اعمال نیّتوں کے ساتھ ہیں۔ جہاں تک ان اعمال کا تعلّق ہے جن کیلئے نیّت کی شرط نہیں، جیسے کھانا پینا۔ تو ان اعمال کو نیّت کی ضرورت نہیں اس وجہ سے لوگ ایسے اعمال کو اعمال کی اس قسم سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں جن کا یہ حدیث احاطہ کرتی ہے۔
>
> دیگر کی رائے یہ ہے، کہ اعمال کے لفظ کو اس کی عمومی طبع پر ہی لینا چاہیے اس پر کسی تخصیص کا اطلاق کیے بغیر۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ جمہور کی رائے ہے جس سے ان کی مراد قرونِ اولیٰ کے جمہورِ علماء ہیں۔ یہ رائے ابنِ جریر الطبری، ابو طلحہ المکی اور مزید متقدّمینِ علما کے بیانات میں ملتی ہے۔ بظاہر امام احمد کا رُخ بھی اسی جانب ہے۔۔۔
>
> ایسی رائے رکھنے والوں کے مطابق حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اعمال ہوتے ہیں یا ظاہر ہوتے ہیں نیّتوں کی وجہ سے۔ یہ ایک جملہ ٔ خبر یہ ہے اور بتاتا ہے کہ ہوش وحواس کے ساتھ بلا جبر کیے گئے اعمال عمل کرنے والے کی نیّت کے بغیر سرزد نہیں

ہوسکتے۔ نیّت ہی ایسے اعمال کی وجہ ہوتی ہے اور ان کے سرزد ہونے کیلئے ضروری ہے۔[1]

نیّت عمل کا ایسا جز تصوّر کیا جاسکتا ہے جس پر عمل کے اللہ کے ہاں مقبول ہونے یا نہ ہونے کا انحصار ہے۔ بہرکیف حدیث میں اس کے بعد آنے والا جملہ نیّت کے تصوّر کے بارے میں اس اہم پہلو سے تعلّق رکھتا ہے۔

ضمیمہ نمبر 2

السدلان لکھتے ہیں،

نیّت دل کے ایک عمل کا نام ہے اور عام طور پر دل کے عمل انسان کے بس میں ہوتے ہیں اور اس کی ذاتی پسند پر منحصر ہوتے ہیں۔ حکم یہ ہے کہ اپنی نیّت کو خالص کرلو کسی ملاوٹ کے بغیر اور یہ طے کرلو کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ اس بات کی ممانعت ہے کہ نیّت میں شرک کرے اور نیّت کو خالص نہ رکھے، یا اپنی نیّت کو ایسا رُخ دے جس کا حکم نہیں۔ یہ سب کچھ ایک ذمہ دار آدمی کی قدرت اور استطاعت میں ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو نیّت کو خالص رکھنے کا حکم یا شرک سے اجتناب ایسے احکام ہوتے جو ایک انسان پورا نہیں کرسکتا۔

لہٰذا، ایک انسان میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ اپنی نیّت کا تعیّن کرسکے اور اس کا رُخ متعیّن کرسکے اور اپنے نفس کو پاک رکھے اس انداز میں کہ اس صلاحیت کو استعمال کرتے ہوئے اپنی نیّت کو اُن سے دور رکھے جن اعمال کے کرنے کی قانوناً اجازت نہیں۔ یہ اس لیے کہ اللہ نے انسان کو عقل عطا کی ہے اور اسے قوّتِ فیصلہ

---

[1] ابنِ رجب، جامی، جلد1، ص ص۔ 65-64۔

اور انتخاب کی آزادی دی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے اچھائی کا راستہ واضح کر دیا ہے۔ اس نے یہ راستہ انسان کیلئے واضح کر کے اسے اس کی طرف پکارا۔ اس نے اچھے کام کرنے والوں کو بڑا اجر اور بیش بہا بدلہ دینے کا وعدہ کیا، اس نے ان کیلئے بُرائی کا راستہ واضح کر دیا۔ اس راستے کے خطرے سے بھی آگاہ کر دیا اور اس پر چلنے والوں کو متنبہ کیا، اور اس کے نتیجے میں ملنے والی سزا سے جو دنیا اور آخرت میں ملے گی ان کو ڈرایا۔ اور مزید یہ کہ اپنے پیغمبر بھیجے، کتابیں اتاریں، ان کو ثبوت اور دلائل دیئے اور اس نے تمام معاملات کو مکمل طور پر واضح کر دیا۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ۔

”یہ سارے رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ اُن کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت نہ رہے۔“(النساء:165)

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا،

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔

”اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ (لوگوں کو حق و باطل کا فرق سمجھانے کے لیے) ایک پیغمبر نہ بھیج دیں۔“(بنی اسرائیل:15)

اس لیے نیّت ایک ایسا عمل ہے جس کا کرنا ہر ذمہ دار انسان کے بس میں ہے۔ یہ اب اس پر منحصر ہے کہ اس راستے پر چلے اور اسباب کا سہارا لے جو اُسے اپنی نیّت کو خالص کرنے کی راہ پر لے جائیں۔ یعنی اللہ کی تخلیقات اور اس کی عظیم نعمتوں پر غور کر کے ان انعامات کو سمجھتے ہوئے جو اللہ کے احکام کی پابندی کرنے والوں کیلئے ہیں اور ان کڑی سزاؤں سے ڈرتے ہوئے جو نافرمانوں کیلئے ہیں۔ اسے چاہیے کہ ان بیش بہا فوائد کے بارے میں سوچے جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والے فرد کو

حاصل ہوں گے، اس دنیا اور آخرت میں۔ جب کوئی ایسا کرلے گا تو اس کا نفس خود اسے اللہ کے احکام پر سچے دل سے اور بہترین طریقے سے عمل کرنے کی طرف مائل کرے گا۔ اگر کسی شخص میں آخرت کے تصوّر کی وجہ سے اللہ کی محبّت، اس کا خوف اور اس سے امید کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں تو اس کیلئے نیّت کو درست کرنا آسان ہوجائے گا۔ کیونکہ دل اسی طرف مائل ہوتا ہے جو (اُسے) اچھا نظر آئے اور (اسکے لیے) اچھا ہو۔

اگر وہ ان اسباب کی پیروی کرے جو اللہ سے دور لے جانے والے ہوں تو پھر وہ اس طرف ہی متوجّہ ہوگا اور اُس کا دل اُسے اُسی طرف مائل کرے گا۔ اِس کا انجام یہ ہوگا کہ وہ ان اسباب سے محبّت کرنے لگے گا اور ان کا عادی ہوجائے گا اور اس صورت میں اُس کیلئے بہت مشکل ہوگا کہ اپنی نیّت کو درست کرسکے اور نافرمانی سے کنارہ کشی اختیار کرسکے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۔

"پھر جب انہوں نے ٹیڑھ اِختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دل ٹیڑھے کردیے۔"

(الصّف:5)

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا،

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ۔

"(بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس شخص کی گمراہی کا) جس کے لیے اس کا بُرا عمل خوشنما بنادیا گیا ہو اور وہ اُسے اچھا سمجھ رہا ہو؟" (فاطر:8)۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نافرمانی کے اسباب اختیار کرنے اور اعمال بد سے دل سخت ہوجاتے ہیں۔ اور پاکیزگی اور اخلاص کمزور پڑجاتے ہیں۔ جیسے جیسے نافرمانی بڑھتی جائے دل مزید سخت ہوتے چلے جاتے ہیں اور اللہ کی فرمانبرداری سے مزید دور ہوتے جاتے ہیں۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ نیّت انسان کے آزاد دائرۂ اختیار میں ہے اور انسان اپنی نیّت کا رُخ متعیّن کر سکتا ہے کہ وہ اچھی ہو یا بُری، تو پھر اُسے نیّت کو حاضر رکھنے کے معاملے میں کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے، جیسا کہ چند اہلِ زہد (درویش) دعویٰ کرتے ہیں۔ احیاء علوم الدین میں امام غزالی نے علماء سلف کی نسبت سے کئی ایسے واقعات کا حوالہ دیا ہے جن میں انہیں اپنی نیّت کو درست کرنے کیلیئے بڑی جدوجہد کرنا پڑتی تھی۔ اور اس کوشش میں وہ کئی کئی دن گزار دیتے تھے لیکن عمل نہیں کر پاتے تھے جب تک ان کی نیّت درست نہ ہو جاتی۔ اگر یہ واقعات مصدّقہ ہیں اُن تک جن پر یہ واردات گزری تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ انفرادی آراء ہیں اور ان پر تکیہ کرتے ہوئے ایک عام اُصول اور ایک فریضے سے انکار نہیں کیا جا سکتا جس کا حکم مذہب دیتا ہو؛ رسول ﷺ یا صحابہ کرام سے کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جس میں نیّت کو حاضر کرنے یا پیدا کرنے کا ذکر ہو۔ ایسی کوئی چیز علمائے سلف کے ہاں نہ عام ہے نہ مشہور ہے۔۔۔[1]

ضمیمہ نمبر 3

{پچھلی صدی کے اواخر میں مغربی ممالک میں یا کم از کم مغربی دنیا کے بڑے شہروں میں

---

[1] السدلان، النیّتہ، جلد 2، ص ص۔444-441۔ اس تحریر میں السدلان نے دو اہم نکات پر روشنی ڈالی ہے اوّل یہ کہ تزکیے اور رویّے سے متعلّق علمائے متقدمین کے کئی اقوال غیر مصدّقہ ہیں، لہٰذا پہلے تو ان کی تصدیق ضروری ہے۔ دوئم یہ کہ اکثر اس قسم کے اقوال ذاتی آرا پر مبنی ہوتے ہیں۔ جیسے کہ کسی شخص سے ایک فقہی مسئلے میں غلطی کا احتمال ہے اسی طرح تزکیے اور رویّے کے معاملے میں بھی غلطی کا احتمال ہے۔ لہٰذا، ایسے اقوال کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں جانچنا ضروری ہے۔ اگر یہ اقوال قرآن اور سنّت کے مطابق ہیں تو انہیں تسلیم کیا جائے گا اور اگر یہ قرآن اور سنّت سے متصادم ہیں تو انہیں رد کیا جائیگا اس سے قطع نظر کہ ان کو بیان کرنے والا کتنا ہی نیک اور پرہیز گار کیوں نہ تصوّر کیا جاتا ہو۔

اسلامی معاشرے کی تشکیل کے نقوش نمایاں ہونا شروع ہوئے اور بات مساجد کی تعمیر سے آگے بڑھ کر مراکزِ اسلامی، اسکولوں اور دیگر اداروں کے قیام تک جا پہنچی، دعوتِ اسلام کا کام بھی منظم طریقے پر ہونے لگا اور یوں مسلمانوں کے ان مقامات پر رہائش اختیار کرنے کے جواز پیدا ہونے لگے۔ اس صورتِ حال کو مزید تقویت اُن حالات سے ملی جو خود اسلامی دنیا کے اکثر ممالک بالخصوص مشرقِ وسطی کے کئی ممالک میں موجود تھے، جہاں اسلام پر قائم رہتے ہوئے زندگی گزارنا اور اسلامی اقدار کے مطابق جینا دشوار ہو گیا تھا۔ سیاسی مخالفین بالخصوص اسلامی فکر رکھنے والے افراد جو سیاسی تبدیلی کی جدوجہد میں شامل ہوئے ان پر ظلم کے پہاڑ ڈھائے گئے۔ اس صورتِ حال میں مغربی ممالک میں ان کا سکونت اختیار کرنا دراصل اپنے اسلام کے تحفّظ کی خاطر ہی تھا۔ ایسی ہجرت کے لیے ہمیں ہجرتِ حبشہ ایک مثال فراہم کرتی ہے، جبکہ رسول ﷺ نے مسلمانوں کو عیسائی حکومت کے تحت ایک علاقے کو ہجرت کرنے کی اس بنا پر اجازت دی کہ وہاں کا حکمران ایک عادل شخص (نجاشی) تھا۔

تقریباً موجودہ صدی کے شروع ہونے کے ساتھ ساتھ ان ممالک میں مسلمانوں کے لیے حالات نے ایک نیا رُخ اختیار کیا اور مسلمانوں کو دہشتگری کے خلاف جنگ کی آڑ میں امتیازی سلوک کا نشانہ بنایا جانے لگا، مساجد کی نگرانی، مسلمانوں کے بنیادی انسانی حقوق کی پامالی، ان کے نوجوانوں کے خلاف جھوٹے مقدمات قائم کرنا اور ان میں سے کئی کو لمبے عرصے کے لیے داخلِ زندان کر دینا روز کا معمول بن گیا۔ اس ناروا سلوک کا شدید ترین مظاہرہ امریکہ میں دیکھنے میں آیا۔

ہجرت کے تناظر میں یہ ایک نئی اور عجیب صورتِ حال تھی۔ وہ آزادی جس کی خاطر بہت سے مسلمانوں نے ان مغربی ممالک بالخصوص امریکہ کا رُخ کیا تھا وہی آزادی ان سے سلب کر لی گئی، مترجم نے اس دور کا ذاتی طور پر مشاہدہ کیا اور اس زمانے میں مسلمانوں کے حلقوں میں

ہونے والی ان بحثوں کو اور مسلمان علما اور مفکرین کے ان خطبوں اور تقریروں کو سنا جو ہجرت کے تناظر میں پیدا ہونے والی اس انوکھی صورتِ حال سے متعلّق تھے۔ بحث یہ تھی کہ کیا ان حالات میں مسلمانوں کا ایسے مقام پر مقیم رہنا جائز ہے یا نہیں۔ کئی خاندانوں نے دوسرے مقامات پر ہجرت بھی اختیار کی، لیکن اکثر اپنی بے اطمینانی کے باوجود کئی دیگر وجوہات کی بنا پر ان حالات میں ہی مغربی ممالک میں زندگی گزارتے رہے اور ان میں سے کئی نے اس کی بڑی قیمت ادا کی اور کئی مسلمان نوجوان اب بھی امریکی جیلوں میں پڑے یہ قیمت ادا کر رہے ہیں۔

موجودہ صدی کی اس دوسری دہائی میں مسلم دنیا میں اور بالخصوص مشرقِ وسطی کے ممالک میں انقلاب کی ایک لہر اٹھی جو کئی دہائیوں سے ان ممالک اور ان کی عوام پر مسلّط ظالم وجابر حکمرانوں کو بہالے گئی۔ امید کی جاسکتی ہے کہ موجودہ صدی میں اسلامی ممالک کے حالات میں مثبت تبدیلی رونما ہوگی اور ان مسلمانوں کے لیے جو اب بھی نامساعد حالات کے باوجود مغربی ممالک میں زندگی بسر کر رہے ہیں ہجرت کے نئے مواقع سامنے آئیں گے۔ انشاء اللہ۔ ہم یہ بھی امید کرتے ہیں کہ مغربی دنیا میں بھی اپنی غلطیوں کا احساس اور ایک معقول رویّہ پیدا ہوگا۔

دورِ حاضر میں جبکہ ساری دنیائے اسلام میں حالات تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں اِکّادکّا ممالک کو چھوڑ کر ایسے حالات بہر حال کہیں بھی موجود نہیں جو ہجرت کا تقاضا کرتے ہوں، اس ہجرت کا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے ہو۔ یہ ضرور ہے کہ معاشی مسائل، امن وامان کی صورتِ حال اور جان ومال کے خطرات موجود ہیں جو شاید ہجرت کے لیے عذر پیدا کرتے ہوں کیونکہ یہ سب جائز ضروریات ہیں جن کے پورا کرنے کی غرض سے ہجرت کرنا شاید جائز تو ہو لیکن یہ ہجرت اس زُمرے میں آئے گی جس کا تذکرہ زیرِ مطالعہ حدیث کے اس حصے میں ہوتا ہے۔ ”جس کی ہجرت کسی دنیاوی فائدے کے حُصول یا کسی عورت سے نکاح کے لیے

تھی تو اس کی ہجرت اس کے لیے تھی جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔" یہ خیال کرتے ہوئے کہ اگر ہجرت ایسے مقام کی طرف ہے جہاں ہجرت کرنے والے کے لیے اسلام پر کھلے عام عمل کرنا مشکل ہو جائے تو یہ ہجرت کے اصل تصوّر ہی کی نفی ہو گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (مترجم)}